دریچہ

(تنقیدی مضامین)

صدیقی صائم الدین

دریچہ

(تنقیدی مضامین)

صدیقی صائم الدین

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

DAREECHA (Tanqeedi Mazameen)

By: Siddiqui Saimuddin

Edition : 01

Price : 145/-

نام کتاب	:	دریچہ (تنقیدی مضامین)
مصنف	:	صدیقی صائم الدین
قیمت	:	145 /-
صفحات	:	230
تعداداشاعت	:	500
کمپوزنگ	:	محمد فیصل صدیقی
سن اشاعت	:	December 2017
پتہ	:	گھر نمبر:1/17/81، جونابازار ہیڈ پوسٹ آفس، اورنگ آباد، مہاراشٹر، 431001
فون نمبر	:	08623903034,08208101043
ای میل	:	siddiquisaim7@gmail.com

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

EDUCATIONAL PUPLISHING HOUSE

3191,Vakil Street,Kucha Pandit,Lal Kuan,Delhi-6(India)

Ph:23216162,2321465,Fax : 0091-11-23211540

E-Mail : info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com

Website : www.ephbooks.com

انتساب

داداجان محمد بشیرالدین صدیقی (مرحوم)

اور

ناناجان شیخ عبدالوہاب (مرحوم)

کے نام

ابــــــــــواب

اب وہ اعجازِ تکلم کی کہاں ہیں شوخیاں 10

مضامین متعلق نظم

۱) روایت کا ناقب خواجہ حیدر علی آتش 14
۲) روایتوں کا شاعر حسرت عظیم آبادی 33
۳) سرور جہان آبادی کی شاعری میں ہنودی کردار 52
۴) آبگینہ وقت فیض احمد فیض 76
۵) اخگرِ روح اسرار الحق مجاز 91
۶) پزشکِ زمانہ علی سردار جعفری 107
۷) اذہابِ ذہن معین احسن جذبی 122
۸) جزالت کا شاعر مخدوم محی الدین 131
۹) سکندر علی وجد کی شاعری میں مصفاتی عناصر 145
۱۰) جاں نثار اختر اپنے فن کی روشنی میں 153
۱۱) اختر الا ایمان کی شاعری میں سماجی حسیت 166

مضامین متعلق نثر

۱۲) مولانا ابوالکلام آزاد اور تقسیم ہند 192

۱۳) عصمت چغتائی حیات اور ادبی خدمات 212

۱۴) افسانہ ''رقص ناتمام'' میں نسوانی مسائل کی عکاسی 220

ایک نظر میں 230

اب وہ اعجازِ تکلم کی کہاں ہیں شوخیاں

شاعری باعثِ لذت قلب ہے۔ اس کے ذریعے انسان شعور کی وہ ادراکیت حاصل کرتا ہے جو اس کے ذہن کے کسی کونے میں مبہم سی خلش کے طور پر بسی ہوتی ہے۔ شعراء اپنے فن کے ذریعے انسان کے ان مبہم نقوش بھرے آئینے کو صاف کرتے ہیں جس میں اُس کے احساسِ محبت و جذبات فطرت پوشیدہ ہوتے ہے۔ اُردو شاعری نے ابتداء سے دور حاضر تک بہت کچھ دیکھا ہے۔ اس کی شعریت کبھی ماندھ نہ پڑی۔ یہ نہ تو کبھی دھندلی ہوئی اور نہ ہی بے کیف۔ ہاں البتہ کبھی کبھار اس میں کچھ تبدیلیاں ضرور رونماں ہوئیں۔ کبھی اس میں معنویت اور داخلیت کو بڑھایا گیا تو کبھی اسے خارجیت کے حوالے کیا گیا۔ ایسا سماج اور حالات کے تحت کیا جاتا رہا۔ لیکن ان تبدیلیوں نے ادب کو ہمیشہ سرخروئی بخشی۔ ایہام سے ترقی پسندی اور ترقی پسندی سے ابہامیت، اردو شاعری نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے چاہنے والوں نے اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑا۔

شاعری چند اشخاص یا محدود زمانے کی دین نہیں ہوتی۔ یہی بات شاعری کو کبھی زوال پذیر نہیں ہونے دیتی۔ میری کتاب میں موجود شعراء پر جتنے بھی مضامین ہیں تمام کے تمام وہ شعراء ہیں جنھوں نے اُردو شاعری میں اپنے انوکھے پن

کی وجہ سے ایک خاص مقام حاصل کیا۔آتشؔ ایک ایسے شاعر تھے جنہوں نے اپنے دور سے بہت بعد کی شاعری کی ہے۔حسرتؔ عظیم آبادی کی شاعری اپنے زمانے اور اعلیٰ طبقے کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔وہیں سرور جہان آبادی کو اپنوں کی جدائی نے جیتے جی مار ڈالا تھا۔

زمانہ بدلا اور بدلے اس کے دستور۔شاعری نے بھی ایک انگڑائی لی اور ایسی طرف کو چلی جس میں دنیا بھر کے مسائل اور حالات کے علاوہ آزادی کی جدوجہد ملتی ہے۔ایسے وقت میں وہ شعراء دکھائی دیے جنہوں نے شاعری کے لیے ایک نئی روش اختیار کی اور اپنی شاعرانہ خیالات کو ایک نیا رنگ، نیا ڈھنگ دیا۔اس سے شاعری میں انفرادیت اور ماوٗرائیت کا خاتمہ ہوا اور حقانیت اور روز مرّہ کے حالات کا ذکر شامل ہوگیا۔اسے ترقی پسندی کے نام سے منسوب کیا گیا۔اس ترقی پسندی نے ایسے نایاب شعرا پیدا کیے جن کے پاس انسانیت کے فلاہ و بہبود کے علاوہ حسن و عشق کا وہ معتدالانہ رویہ ملتا ہے جو حقیقت سے قریب تر اور انسانی فطرت کو عیاں کرتا ہے۔اس تحریک نے فیض احمد فیضؔ، مجازؔ، جعفریؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، وجدؔ اور جانثار اخترؔ جیسے جواہر پارے ادب کو بخشے۔لیکن شاید اُردو کو ابھی اور کچھ بھی چاہیے تھا۔ وہ اپنی روایت کی امین تھی اسی لیے اُس نے اختر ایمان جیسے شعرا پیدا کیے جن کے پاس ایک نیا لہجہ اور نئی شعری بنیادیں موجود تھیں۔جو اجتماعیت کے علاوہ فرد کی ذات کو اس کے داخلی جذباتوں کو بھی بخوبی سمجھتے تھے۔

اس کتاب کا مقصد اُردو شاعری کے تین ادوار کو ایک کتابی شکل میں پیش کرنا تھا جس سے قاری تینوں ادوار کے فرق کو بخوبی سمجھ لے۔اپنی پچھلی کتاب

''مطالعہ معین احسن جذبی'' کے اندر میں جذبیؔ کی شاعری کا پر مفصل تجزیہ کر چکا ہوں ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کی تمام خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔لیکن اس کتاب میں اس تحریک کو جگہ دینے کا مقصد شاعری کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہے۔اس کے لیے میں نے مختلف ادوار کے شعراء کے کلام کا تجزیہ آپ کی نظر کیا ہے۔علاوہ ازیں چند نثری مضامین بھی شامل کیے ہیں جن میں تقسیم ہند کے وجوہات کو مولانا آزاد کی تحریروں کے تحت سمجھا گیا ہے۔ساتھ ہی ادب کی ایک بڑی شخصیت عصمت چغتائی کی سوانح اور ان کے ادب پر بات کی گئی ہے۔اسی کے ساتھ عزیز احمد کی تحریروں میں خواتین کے مسائل سے متعلق لکھے گئے افسانہ کا تجزیہ کرتے ہوئے دور حاضر میں اس کی اہمیت و افادیت کو دکھلانے کی کوشش ہے۔اپنی پچھلی کتاب پر آپ تمام کے تبصروں اور خوش آیند مستقبل کی دعاؤں کا شکر گزار ہوں۔

میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو نئی پود کے لیے نہ صرف راستہ ہموار کر رہی ہے، ساتھ ہی اگلو کی حاضر سے اور پچھلوں کی ناظر سے دوری کو ختم کرنے کی ممکنہ کوشش میں لگی ہوئی ہے۔اب یہ تحریر آپ کی نظر ہے آپ تمام کی اصلاحی آراء کا انتظار رہیگا۔جو میرے لیے ہمیشہ رہنمائی کا سبب ہوتی ہیں۔

صدیقی صائم الدین

اورنگ آباد، مہاراشٹر

مضامین
متعلق نظم

روایت کا ناقب خواجہ حیدر علی آتشؔ

اٹھارویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی ،سماجی، معاشی اور ادبی لحاظ سے اہم رہی۔اس عہد میں سیاسی اعتبار سے جہاں دلی پر حملے ہورہے تھے وہیں سماجی اورمعاشرتی حالات میں ناپائیداری کومسلسل محسوس کیا جارہا تھا۔لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت چاہتے تھے۔لیکن بادشاہ وقت کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ دلی کی حفاظت کرسکے۔ دلی اوراس کے اطراف نادرشاہ، احمدشاہ ابدالی، مرہٹوں، روہیلوں،اور جاٹوں کے حملے اتنے بڑھ گئے تھے کہ پایہ تخت کی بنیادیں مکمل طور پر ہل چکیں تھی۔ دارالسلطنت کی بنیادوں میں ایسی سیند لگ چکی تھی جس سے ابھرنا وقت کے بادشاہ شجاع الدولہ کے بس کی بات نہ تھی۔ بادشاہ نے حالات کی ابتری کو بھانپ کر پہلے تو فیض آباد کا رُخ کیا اور بعد میں اپنا پایۂ تخت لکھنؤ کو بنالیا۔شجاع الدولہ کے فیض آباد آتے ہی یہاں کی رونقیں بڑھ گئیں۔ یہاں پر کافی امن تھا جس وجہ سے

ادب کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی اور دلی کے بہت سارے شعراء کرام فیض آباد آ بسے جس کے نتیجہ میں فیض آباد ایک ایسا ادبی مرکز بن گیا جو کہ بعد کو لکھنؤ کے دبستان کی بنیادیں قائم کرنے میں معین و مددگار ثابت ہوا۔

جس زمانے میں شجاع الدولہ فیض آباد میں قیام پذیر تھا۔فیض آباد کی رونق دیکھتے ہی بنتی تھی۔جگہ جگہ شعراء کرام اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے خود شجاع الدولہ کی محل میں دن رات ادبی محفلیں جمنے لگی تھی۔ان محفلوں کی اہم خوبی یہ رہی کہ یہاں عربی اور فارسی سے زیادہ اُردو شاعری کو تقویت دی جانے لگی تھی۔فیض آباد آنے والوں میں ایک ذی عزت خاندان خواجہ علی بخش کا بھی تھا۔خواجہ علی بخش کا تعلق بغداد سے تھا جن کے جدّ امجد خواجہ عبید اللہ احرار تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے اہم شخص تھے۔اس طرح خواجہ علی بخش کے خاندان کو تصوف کا مزاج ورثہ میں ملا تھا۔دلی سے فیض آباد آنے پر انھوں نے محلّہ مغل پورہ میں قیام کیا۔ اور یہی انھیں ایک فرزند نرینہ ہوئی جس کا نام ''خواجہ حیدر علی'' (آتش) رکھا گیا۔ یہ ۱۷۷۸ء کی بات ہے۔

اُس زمانے کے عین مطابق بچے کو یا تو باپ خود تعلیم دیتا یا کوئی اتالیق متعین کیا جاتا۔لیکن آتش کے ساتھ المیہ یہ رہا کہ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ایسے میں اس بچے کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو کہ کسی بن باپ کی اولاد کے ساتھ بے توجہی کے سبب ہوتا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ آتش کی تربیت عام آوارہ بچوں کی طرح ہوئی لیکن ذہین ہونے اور خاندانی ورثہ (تصوف) کے سبب وہ کبھی راہ سے نہ بھٹکے انھوں نے بچپن میں جہاں تک ہو سکا تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی اور عربی، فارسی اور اُردو کی بعض اہم

کتابیں پڑھ لیں۔والد کا سایہ سر پر نہ تھا اور کسی قسم کی پابندی نہ ہونے کے باعث اپنے شوق پر زیادہ توجہ کی جو کہ تلوار بازی اور فن سپہ گری تھی۔اُس زمانے میں بانکوں کا بڑا چلن تھا اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ شاعری میں بھی محبوب کو بانکوں سے تشبیہہ دی جاتی تھی۔ بانکے دراصل اپنے زمانے اور قوم کی بے بسی اور جھلاہٹ کے شکار نوجوان ہوا کرتے تھے جو حکمرانوں اور دیگر عوام کی بے حسی کے ساتھ ساتھ دبے کچلے احساسات کے سبب وجود میں آئے تھے۔یہ وہ لوگ تھے جو اپنے سر، داڑھی مونچھے، یہاں تک کہ ابروؤں تک کو منڈوا کر کبھی ننگے سر تو کبھی زعفرانی یا نیلے لبادے اُوڑھے اپنے گھوڑوں پر سوار ہر وقت ہتھیاروں سے لیس مزاج میں ترشی اور جنگ کے لئے للکارتے پھرا کرتے تھے۔لوگ اکثر ان سے اجتناب کرتے۔ان لوگوں کا مزاج قلندرانہ ہوا کرتا تھا کسی کی مدد کر دینا یا کسی سے سرراہ اکڑ جانا ان لوگوں کے مزاج کا خاصّہ تھا۔آتش خود بھی ایک بانکے تھے۔مزاج کی قلندری نے انھیں اس جانب راغب کیا تھا۔نوجوانی میں وہ بات بات پر اپنی تلوار سوت کر کسی کو بھی للکار دیا کرتے۔جس کے سبب پورے علاقہ میں ''تلوریے'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ان کا حلیہ بھی اوپر تحریر کردہ حلیہ کے عین مطابق تھا۔

آتش زمانے سے بہت آگے کی سوچ رکھتے تھے اُن کے اشعار اس بات کی بخوبی گواہی دیتے ہیں۔اُن کا مزاج شروعات ہی سے قومی ہمدردی اور تصوف کی طرف راغب نظر آتا ہے۔شعور کا ادراک ان کے پاس مستحکم سانچے میں ڈھلا ملتا ہے۔اس شاعر نے اپنی قلبی و ذہنی فکر کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال کر ایک ایسی فضاء ہموار کی جو جدید شاعری کو جنم دیتی ہے۔یہ سچ ہے کہ آتش کی تعلیم و تربیت اُس

طرح نہیں ہوئی جیسی والد کے زندہ رہتے ہوتی لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اُردو، فارسی اور عربی کی اچھی خاصی تعلیم حاصل کی تھی۔انھیں نہ صرف ان زبانوں کی آداب وقواعد کا علم تھا بلکہ ان زبانوں کی شاعری اور ان کے تاریخی پس منظر سے بھی وہ بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ان کے پاس ایسے کئی اشعار مل جاتے ہیں جس میں عربوں اور فارسیوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آب جوئیں ہیں صفا سے سینۂ اشراقیاں
ہر گلِ خوشبو ہے افلاطونِ یونانِ بہار

اسی طرح مریخ، مشتری، برجِ دلو اور برجِ میزان ایسی اصطلاحیں ہیں جن کا استعمال بھی ان کے اشعار میں ملتا ہے۔آتش کو اُردو شاعری سے رغبت کیسے اور کیونکر ہوئی اس کی تاریخی وضاحت نہیں ملتی، لیکن جب بادشاہِ زمانہ وقت کے دربار میں ہی اُردو شاعری کا چل چلاؤ ہو تو عوام اس سے بے فیض کیونکر رہتی۔آتش خود اپنی سخن سنجی اور اُردو سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

سالہا سال سے تحصیلِ سخن ہے آتش
اس قلم رَو میں مدت سے اجارا اپنا

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

دمِ فنا ہووے تو ممکن ہے سخن گوئی کا ترک
آب دریا خشک ہو جاوے تو ہو نایاب موج

آتش کا شاعری سے لگاؤ اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے اُردو شاعری میں کئی تلمیحات کو وجود بخشا ’’ابراھیم بن ادھم، قوم عاد، داؤد نبی، ابولہب کی جھوٹی باتیں،

دجّال و مہدی کی آمد، ایوب نبی‘‘ وغیرہ جیسی تلمیحاتی اشارے ہمیں شروعاتی طور پر آتش ہی کے پاس ملتے ہیں۔

آتش اپنے دور کا ایک عظیم شاعر ہے۔ وقت اور روایت سے ہٹ کر آتش نے مزاج اور داخلیت کے تحت اشعار کہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ان کی شاعری میں جتنی خارجیت ملتی ہے اس سے کہیں زیادہ داخلیت کو دخل ہے۔انھوں نے اپنے اشعار کے لیے جن لفظوں کو مناسب جانا بے دھڑک ان کا استعمال کیا۔انھیں اس کی پرواہ کبھی نہ تھی کہ زمانہ اسے قبول کرے گا یا نہیں۔اپنی غزلوں میں آتش نے ایسے کئی عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے جن کو اُردو شعراء استعمال کرنے سے اجتناب برتے آئے تھے۔لیکن آتش نے ان الفاظ کو جدید پیرائے میں استعمال کرتے ہوئے شاعری میں نیا پن لانے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

جانبِ مقسوس آہ ہوتی ہے رواں
یہ کماں اک دن نشانہ ہے ہمارے تیر کا

نامانوس الفاظ اُس وقت نئے شعراء کے لیے قابل اتباع نہیں تھے لیکن آتش کو اس سے سر مو فرق نہیں پڑا۔

فائق ہو غضب پر کرم اس بُت کا الٰہی
اِجلَس وہ دل آرام کہے قُم سے زیادہ

ایک اور جگہ دیکھئے۔

ایک دن دعوتِ جمازۂ لیلےٰ ہوگی
اس لیے بیچ میں مجنوں ہے یہ، ہر سو کانٹے

ایسے الفاظ جس کا ذکر عام شعراء پسند نہیں کرتے وہ اُسے بھی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔

اک مشت استخواں پہ نہ اتنا غرور کر
قبریں بھری ہوئیں ہیں عظامِ رمیم سے

آتش نے اپنی شاعری میں بعض ایسے ہندی کے رائج الوقت الفاظ استعمال کیئے جنھیں عام بول چال کی زبان میں استعمال تو کیا جاتا رہا لیکن شعراء انھیں اپنے کلام میں ہرگز جگہ نہیں دیتے تھے۔ وہ ان الفاظ کو اپنی شاعری میں نہ صرف جگہ دیتے ہیں بلکہ ان عامیانہ الفاظ کو افتخاری درجہ دیتے محسوس ہوتے ہے۔

۱)

دو آنکھیں چہرے پر نہیں تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے، دیدار کے لیے

۲)

صفا ہوا نہ ریاضت سے نفسِ امّارہ
کوئی نجاستِ سگ کا ازالہ کیا کرتا

عام روش سے ہٹ کی کی جانے والی شاعری نے انھیں کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن ان کے یہاں شاعری سے زیادہ اہم کچھ اور نہیں:

پینے کو آتش شیدا کے گاتی باندھ کر
دلرُبائی ختم کی اُس جانِ جاں نے گات میں

اس میں شک نہیں کے آتش ایک بڑے شاعر تھے اور یہ اشعار اُن کی پستی یا

بے راہ روی کا نمونہ نہیں کہے جا سکتے ۔ یہاں ان اشعار کا ذکر اُن کے مزاج کے بیبا کانہ رویے کو پیش کرنے سے مقصود ہے۔ جن میں عام روش اور اتباعیت سے ہٹ کر ایک نئی راہ کی تلاش اور اُسکی جستجو نظر آتی ہے ۔آتش کا مزاج کسی کے سامنے جھکنے یا ہاتھ پھیلانے کا کبھی نہ رہا۔ وہ کبھی کسے کے سامنے اپنے عجز کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کے عشق کی واردات میں بھی ان کی اس خود نمائی کا عنصر نمایا طور پر ملتا ہے۔

پیچھے ہٹا نہ کوچۂ قاتل سے اپنا پاؤں
سر سے تڑپ کے چار قدم آگے دھڑ گیا

آتش بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے کلام میں عشق کا روایتی انداز میں نہیں ملتا۔ وہ اپنے زمانے سے آگے کی شاعری کرتے رہے۔ اُن کے مزاج نے انھیں روایتی شاعری سے مختلف لب و لہجہ دیا تھا۔ جس پر بعد کو کئی شعرا نے قدم بڑھایا۔ وہ شاعری میں ایسی جذباتیت کے پرستار رہے جس سے محبوب عشق اور وصال کی طرف راغب ہو جائے۔ آتش شاعری میں جذاتیت کا سہارا لیکر محبوب کے حسن کی تعریف، اُس کے انداز، اُس کی نزاکت کے علاوہ رقیبوں کا ذکر بالکل مختلف پیرائے میں کرتے ہیں۔

حسن پری ایک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

گریاں ہے اگر شمع تو سر دھنتا ہے شولہ
معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اُس کا

غزل کے آخری بند میں انھوں نے جس انداز میں شمع اور پروانے کا ذکر کیا ہے وہ اُردو شاعری کو ایک نئے مقام پر لے گیا ہے۔ آتش نے محبوب کی تعریف کے لیے جہاں ایک طرف شمع پر اُسے نہ صرف فوقیت دی ہے بلکہ شمع کے عاشق پروانے تک کو محبوب کے حسن کو دیکھ جل مرنے کی کیفیت کا ذکر کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے شمع اور شولے کو ہیچ اور مجبور دکھلا کر ہم پر اپنے محبوب کے جاودانی حسن کو آشکار کیا ہے۔ وہ جس انداز سے محبوب کا ذکر کرتے ہے ہمیں پروانہ کے اندر بھی حسد وجلن پیدا ہوتی بخوبی محسوس ہوتی ہے۔ وہ محبوب سے ہمکلام ہوتے وقت ایک خاص لہجہ اختیار کرتے ہیں۔

سن تو سہی جہاں میں ہے ترا افسانہ کیا
کہتی ہیں تجھ سے خلقِ خدا غائبانہ کیا
کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کے ناز سے
بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا

اسی غزل میں محبوب کے نظروں کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دلفریب انداز میں شکار ودام کے کھیل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ترچھی نگہ سے طائر دل ہو چکا شکار
جب تیرِ کج پڑے تو اڑے گا نشانہ کیا

صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیر باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

ان مصرعوں پر غور کرنے سے آتش کی شاعری کا اچھوتا پن محسوس ہوتا ہے۔ محبوب کے حسن ادا اور اُس کے انداز دلبری کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ واقعی دلچسپ اور آفریں انگریز ہے۔ ایک اور قابل ذکر بات لفظ صیّاد کی اصطلاح کو محبوب سے جوڑنا ہے یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جو شاندار طریقے سے کامیاب رہا۔ ایسے صیّاد سے گرفتاری پر کسے عذر ہو سکتا ہے جس کے عذار کا دیدار بھی ہو رہا ہے۔ یعنی رُخسار اور اُس کے حسین گالوں کی نرماہٹ اور سرخی سے کسی کا بیر ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں بلبل کو جس طرح قید میں اپنے آشیانے کا ہوش نہیں رہتا۔ ٹھیک اُسی طرح شاعر کا بھی اس قلبی واردات سے ہوش جاتا رہا اور وہ بیک وقت انبساطیت اور تطرق کا شکار ہو چکا ہے۔

عشقیہ معاملات میں اُن کے نظریات بہت فطری ہیں۔ وہ عشق کرتے ہیں لیکن غائبانہ عشق اُن کے پاس جگہ نہیں پاتا بلکہ ان کا عشق ایک ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جو گوشت پوست کا مالک ہے۔ جو بدن رکھتا ہے اُس میں روح بستی ہے۔ جس کے جسم کے ہر انگ میں جان ہے وہ نشاطِ حسن کی ایسی آمیزش سے وجود پاتا ہے جس نے شاعر اور زمانے کو بیخود کر رکھا ہے۔ وہ وصال اور ملاقات کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسے حقیقی معشوق سے روبرو کرواتے ہیں جس کا حسن تو ماورائی ہو سکتا ہے لیکن مزاج انسانی فطرت کی عکاسی ہے۔ جو اپنے عشقیہ کیفیات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جس میں انسانی فطرت اور جسمانی خواہشات دونوں بھی موجود ہے۔

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

خاک پر سنگ دریا نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

شام سے وصل کی شب آنکھ نہ جھپکی تا صبح
شادیِ دولت دیدار نے سونے نہ دیا

وہ محبوب کی تلاش اور جستجوں میں کوشاں بھی ہوئے۔اُن کے مطابق اُن کا محبوب اتنا حسین ہے جس کی خواہش ہر ایک کے دل میں ہے پھر چاہے وہ کوئی عام انسان یا کوئی اللہ والا۔ بقول ان کے یہ اللہ والے بھی ان کے معشوق کے حسن کی تعریفیں سن کر اُس کے متلاشی ہوئے لیکن اسے پا نہ سکے۔وہ جس طرح اپنے حسین محبوب کے دیدار کے لیے کوشاں ہیں ایسے ہی دنیا کے کئی بڑے لوگ اُسے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں یہاں تک کہ دنیا کا ایک بڑا راہ نما (مراد خضرؑ) جسے خدا نے ہر ایک کی راہنمائی کے لیے متعین کر رکھا ہے وہ بھی ان کے محبوب کو تلاش کرنے سے خاصر ہے۔

خضر سے راہِ وطن کیا سمجھ کر پوچھوں میں
مجھے خود یہ غریب الوطن نظر آیا

ہوا جو ذکر چمن میں تری نزاکت کا
سفید رنگِ رُخِ یاسمین نظر آیا

وہ اپنے محبوب کی عیاریوں سے بڑے خوش نظر آتے ہیں۔اُن کا محبوب

معصومیت کے ساتھ ساتھ ایسے ذہن کا مالک ہے جسے اپنے حسن اور اس کی عیاریوں کا بخوبی علم ہے۔

روانے سے لڑایا ہے بلبل کو رات بھر
شمعوں میں عطر یانے مل کر گلاب کا

محبوب کی آمد اُن کے پاس بڑی دلفریب انداز میں ملتی ہے۔محبوب کا انداز، اُس کے حسن کی کارفرمائیاں، اُس کی پرلطف ادائیں، اُس کی معصومیت اور چالاکیاں علاوہ ازیں اُس کی قربت کا ذکر جس طرح آتشؔ نے کیا وہ ان کی شاعری کا خاصّہ ہے۔

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
یقین ہوگیا شبنم کو آفتاب آیا

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا
سلام جھک کے کروں گا جو پر حجاب آیا

کسی کے محرم آب رواں وہ یاد آئے
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

وہ محبت میں پاکیزگی کے پرستار ہیں۔کسی بھی عمل سے وہ پہنے چشم نظر نہیں آتے۔محبوب سے وصال پر وہ بااختیار ہوتے ہوئے بھی ایک پاکیزہ اور لطیف رشتے کی پاسداری کرتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کسی عشق میں کہاں تک اجازت ہوتی ہے اور کہاں سے عشق ختم اور ہوس کی ابتداء ہوتی ہے۔ان کے پاس محبوب کا وصال ہی سب کچھ نہیں بلکہ وہ بھروسہ مقصد اولیں ہے جس کی بنیادوں سے محبت کا بیج وصالی پیڑ کی

شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ان کے والہانی محبت میں پاکیزگی کا وہ جذبہ گھلا ہوا ہے
جس میں عریانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

شب فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا
جگایا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا
عدم میں ہستی سے جا کر یہی کہو گا میں
ہزار حسرتِ زندہ کو گاڑ داب آیا

انھیں اپنی ڈھلتی عمر اور بوجھل جسم کا احساس تو ہے لیکن محبت کی توانائیوں
سے دوری ان کے بس کی بات نہیں۔

۱)

محبت مئے وہ معشوق ترک کر آتش
سفید بال ہوئے موسمِ خضاب آیا

۲)

خواب میں مجھ کو خیال نرگس مستانہ تھا
آنکھ کھولی تو لبالب عمر کا پیمانہ تھا

ان کے پاس ہر قسم کے جذبے کو جگہ ملتی ہے۔ وہ محرومی وافسردگی، دھوکہ ، دردمندی، قناعت، خوشی، غم، مظلومیت، اور جاں کنی جیسے تمام فطری لوازمات سے اپنی شاعری کو مکمل کرتے ہیں۔ان کے پاس ماوٗرائیت کو اُسی حد تک جگہ دی گئی ہے

جب تک وہ عالم خواب میں ہوتے ہیں۔ وگرنہ تمام شاعری میں حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔مختلف کیفیات پر ان کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

محرومی وافسردگی:

۱)

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

۲)

روز مولود سے ساتھ اپنے ہوا غم پیدا
لالہ ساں داغ اٹھانے کو ہوئے ہم پیدا

شرمندگی:

بیمار رنج و محن سے نکل گیا
بیچارہ منہ چھپا کے کفن سے نکل گیا

دوستوں کی بے التفاتی:

۱)

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار
کلب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا
دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

۲)

دوست ہی دشمن جاں ہوگیا اپنا آتش
نوش دارو نے کیا یاں اثرِ کم پیدا

۳)

دوست دشمن نے کیے قتل کے ساماں کیا کیا
جانِ مشتاق کے پیدا ہوئے خواہاں کیا کیا
پھر سکی میرے گلے پر نہ چھری ہی ظالم
ورنہ گردوں سے ہوئے کارنمایاں کیا کیا

دردمندی:

میری ایذا کے لیے مردے میں جان آتی ہے
کاٹنے دوڑتی ہے ماہی بے آب مجھے

جنون:

بیاباں کو بھی ہنگامِ جنوں میں سیر کر دیکھا
سرِ شوریدہ کو پائے غزالاں پر بھی دھر دیکھا
تری مستانہ آنکھوں کی نہ گردش کا اثر دیکھا
مئے گل رنگ سے سوسو طرح پیمانہ بھر دیکھا

مظلومیت:

نیا غمزہ کیا صیّاد نے اپنے اسیروں سے
کیا آزاد اُسے جس مرغ کو بے بال و پر دیکھا

قناعت:

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بےخزاں ہے

بادیہ پیمائی:

شہر میں قافیہ پیمائی بہت کی آتش
اب ارادہ ہے مرا بادیہ پیمائی کا

رجائیت:

دولت ساقی سے مالا مال ہے پیمانہ آج
بادشاہ وقت ہے اپنا دل دیوانہ آج
امتیاز خوب وزشت اپنے زمانے میں نہیں
ایکساں ہے آہوئے مست و سگِ دیوانہ آج
چشم وحدت میں ہیں اپنی نیکی و بد دونوں ایک ہی
گرگ و یوسف سے برابر ہے ہمیں یارانہ آج

ان کا تصوف سے بھی بڑا خاص تعلق رہا۔ مذہبیت اور اصلاح انسانیت ان کی شاعری میں جا بہ جا بکھری ہے۔ انہوں نے اکثر جگہ مشرقی تہذیب کو مذہب اور مذہب کو مشرقیت میں زم کیا ہے۔ اصلاحِ معاشرہ اور انسانی زندگی میں خدا حق کی تلاش وجستجو میں ہر ایک کو کوشاں دیکھنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی آپسی تفرقات کو ختم کر کے ایک ہونے کی ان کے پاس بار بار سعی ملتی ہے۔

معرفت ایک ایسا موضوع ہے جس پر انسان کے ذاتی نظریات کا غلبہ ہوتا

ہے۔ یہ انسان کے اُن پہلوؤں کی امین ہیں جس میں اُسے اپنے خدا سے تعلق اور اُس کی اتباع میں اپنی کامیابی نظر آتی ہے۔ آتش کے پاس یہ تعلق اُن اشعار کے ذریعے رونماں ہوا ہے جو انھیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا۔ بزرگانِ دین سے قلبی تعلق، انسانیت کی فکر، قناعت پسندی، اور توکّل ایسی باتیں رہیں جنھوں نے آتش کو بے راہ روی کا شکار نہ ہونے دیا۔ حالانکہ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے بادشاہِ وقت کی صحبت انھیں باآسانی دنیاوی لوازمات اور حشم وخدم مہیا کروادیتی لیکن آتش نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ ان کی قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی سے کبھی اُدھار نہیں مانگتے تھے۔ کئی ناقدین نے ان کے توکّل پر قصّہ بیان کیا ہے کہ آتش کے پاس ایک قیمتی چھلّا ہوا کرتا تھا (غالباً 'سونے' سے بنا) جو کہ ان کے عصا پر لگا رہتا۔ جب کبھی آتش کو پیسوں کی ضرورت لاحق ہوتی وہ بازار جا کر اس چھلّے کو رہن رکھوا کر رقم حاصل کر لیتے اور بعد کو رقم لوٹا کر چھلاّ واپس لے آتے۔ ان کے اسی مزاج نے انھیں تصوف سے بہت قریب کیا۔ ان کی بہت ساری غزلوں میں ان کے صوفیانہ تصوارت عیاں ہیں۔ انھیں اپنے خالق سے تعلق پر بہت ناز ہے۔

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

خدا کی ذات کی تلاش اور اُس کی جستجو کو مقصد حیات بنا لینا ہی انسان کی ابدیت ہے۔ یہی ان کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔

یہ رنگ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اس نے منزل مقصود کو زیرِ قدم پایا

جب انسان کو وجود بخشا گیا تو اسے اس کی عظمت بھی بتلائی گئی۔

آتش دل خستہ تیرا یا الٰہی کچھ نہ تھا
قطرۂ ناچیز کو دریائے بے پایاں کیا

انسان کو خدا نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ لیکن انسان اگر نافرمانی پر اُتر آئے تو اس کا حساب کتاب لازمی ہے۔ اگر انسان مرد خدا بن جائے تو اس کے ساتھ خدا کبھی ناانصافی نہیں ہونے دیتا۔ اس کی مثال آتش نے موسیٰ اور فرعون کے قصے سے دی ہے۔

شرط ہے رتبۂ مردانِ خدا کا انصاف
ڈوبا فرعون وہیں موسیٰ وہیں پایاب اُترا

توکل انسان کی زندگی کی معراج ہے۔ اگر انسان اپنی خواہشات کی وسعت کو کم کر دے تب اس کی زندگی باعث رشک بن جائے۔ آتش کے پاس یہی بات ایک نئے پیرائے میں ملتی ہے۔ وہ ایسے وقت جب کہ امراء وسلاطین اپنی التافیت کا اظہار لوگوں کو سونے چاندی کے انبار کی شکل میں عطا کیا کرتے تھے اپنے لیے ایک جوڑا بھی کسی کا دیا ہوا پسند نہ کرتے تھے۔

خوش ہوتے ہیں ناداں پہن کر کمخواب کا جوڑا
کفن سے عاقبت اس عالم اسباب کا جوڑا
پھٹے کھڑے گزی کے اس سے ہم بہتر سمجھتے ہیں
اگر اُترا ہوا ہووے تنِ نواب کا جوڑا

آتش نے پوری ایک غزل مسلم نوجوانوں کے نام کی ہے۔ وہ اصلاح کی

خاطر مسلم نوجوانوں کو مکمل طور پر احساس شرمندگی سے آشنا کراتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان اگر کسی بات پر شرمندہ ہو جائے تو اپنی انا اور خودی کے خاطر ضرور اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

فریب حسن سے گبرو مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخم شہیداں کا
تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا

اثر اکسیر کا یمنِ قدم سے تیری پایا ہے
جذامی خاکِ رہ مل کر بنات ہیں بدن بگڑا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

صفائے قلب سے ان کی بے انتہا محبت کو یوں پیش کرتے ہیں۔

دیدۂ عارف سے جب دیکھا تو یہ روشن ہوا
مظہر نورِ الٰہی حسنِ مشتِ خاک تھا
منتظر تھا وہ تو جُست و جو میں یہ آوارہ تھا
شیفتہ تیرا ہی تھا جو ثابت و سیّارہ تھا

انسانی قلب ان مخفی گناہوں پر نفس کو اصلاح کا جانب راغب کرتا ہی رہتا

ہے جس سے انسان کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آجاتا ہے۔ یہ ایسا مستقل عمل ہے جو کسی اوتاد یا ابدال کے بس کی بھی بات نہیں۔ کیونکہ قلوب کا بہتری کی جانب پلٹنا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ابدال سے ہوا نہ تو اوتاد سے ہوا
اے جذبِ دل کو کچھ تری امدا سے ہوا

الغرض آتش کے پاس عشق ہو کہ تصوف۔ دنوں ہی بدرجہ اتّم موجود ہیں۔ ان کے شاعری میں اپنے زمانے کی روایت بھی ہے اور اس سے بغاوت بھی۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی ہے اور جدید لوازمات بھی۔ خودنظری اور آگاہی کی جو کیفیت ان کے پاس ملتی ہے اس کی وجہ سے وہ قدیم اور جدید غزل کی اہم کڑی نظر آتے ہیں۔

☆

روایتوں کا شاعر حسرتؔ عظیم آبادی

حسرت کا مکمل نام ''میر محمد حیات'' خطاب ''قلی خاں'' اور تخلص ''حسرت'' فرماتے تھے۔ان کی سالِ والادت کا کوئی جامع ثبوت نہیں ملتا۔لیکن بعض محققین و ناقدین نے اُن کی سال ولادت ۱۱۴۰ھ (۲۸۔۱۷۲۷ء) بتائی ہے۔وہ سرزمین عظیم آباد کی پیدائش تھے۔حسرت کی سوانح عمری کہیں دستیاب نہ ہوسکی اس لیے اُن کے آباواجداد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔خود حسرتؔ کی حیات میں ہی جب ان کی شہرت کا غوغہ عام ہوا تو ان کے خاندانی پس منظر پر شاید سوال اُٹھا جس کا جواب حسرتؔ نے کچھ یوں دیا۔

حسرتؔ مجھے مت پوچھ کہ تو کون ہے اے یار
گمنامی مرا نام جنوں میرا نسب ہے

میں عشق کی خواری کو شرف سمجھا ہوں اپنا
ہے میرا یہی نام و نسب اور حسب
مرا نام و نسب کیا پوچھتا ہے اے شہِ خوباں
تمہارا کمتریں عاشق ہے حسرتؔ اس کو کہتے ہیں

ان کی ابتدائی تعلیم کا بھی ٹھیک سے کہیں ذکر نہیں ملتا۔چونکہ عظیم آباد اُس دور میں علم کو گہوارہ تھا اس لیے گمان کیا جا سکتا ہے کہ عربی، فارسی کی بنیادی تعلیم وہیں سے حاصل کی تھی۔حسرت شاعری میں ''حزیںؔ'' کے شاگرد رہے جو کہ اُن کے سالے بھی لگتے تھے ایک اور روایت کے مطابق حسرتؔ نے ''مرزا مظہر'' سے بھی اپنی غزلوں کی اصلاح لی ہے۔حسرتؔ کی ابتدائی تعلیم میں عربی اور فارسی کا پڑھا جانا اُن کے دیوان میں اس کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔اُن کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ حسرت کو عربی سے کسی حد تک لیکن فارسی سے اچھی خاصی واقفیت حاصل تھی۔حسرتؔ کا تعلیم یافتہ ہونا اور فارسی پر عبور رکھنا اس طرح بھی ثابت ہوتا ہے کہ حسرتؔ اُس دور میں نوابؒ سراج الدولہ کے پاس ''داروغگی'' اور ''عرض بیگی'' جیسے اونچے عہدے پر فائز تھے (بحوالہ (۱) گلزارِ ابراہیم۔مخطوطہ رضا لائبریری۔رام پور، (۲)۔ تذکرۂ مسّرت افزا۔ص ۷۰، مصنف ابوالحسن) جو کسی کم قابل لکھے کے لیے ممکن نہیں لیکن مسئلہ یوں اُٹھتا ہے جب حسرت خود اپنے کلام کے ذریعے اپنے علم و ادب سے بے خبری کا اظہار کر دیتے ہیں۔

ہم جہاں میں حسرت اک مجنونِ مادرزاد ہیں
کب خبر ہے ہم کو کیا ہے علم اور کیسا ادب

ہوں میں اک عاشق بیباک وخراباتی و رند
مجھ سے مت پوچھ مرے علم و ادب کا احوال

یہ اشعار جہاں بیزاری اور خودسری کا پختہ ثبوت ہیں وہیں حسرتؔ کی بے ثباتی اور عظمت کو بھی پیش کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا بھی لازم ہے کہ حسرت اکثر اپنی شاعری میں فرضی مضامین اور قافیے کی رعایت کی غرض سے بہت کچھ لکھ دیا کرتے ہیں۔ بہر حال اس بات کا ثبوت تو کم از کم مل ہی جاتا ہے کہ اچھے گھرانے کی بچوں کی طرح تربیت حاصل کی اور مزاج میں خود چاہی کا عنصر نمایا طور پر تھا۔ اس لحاظ سے اچھی تعلیم وتربیت کا ہونا لازم ہی ٹھہرا۔ حسرتؔ کی شادی اُس دور کے مشہور شاعر حزیںؔ کی بہن سے ہوئی تھی۔ اُن کا عظیم آباد کا کل قیام ۲۲ سالہ رہا۔ اسی بیچ اُن کی شادی بھی ہوئی لیکن شادی کا سال متعین کرنا مشکل امر ہے ایک قیاس یہ ہے کہ اُن کے پورنیہ جانے سے قبل جب اُن کی عمر ۲۱ اور ۲۲ سال کے آس پاس تھی اُن کی شادی ہوگئی تھی۔ حزیںؔ چونکہ خود ایک اچھے گھرانے کے فرد تھے ساتھ ہی اچھے شاعر یوں حسرتؔ اور حزیںؔ کے تعلقات کو استوار ہوجانا اور پھر یہ تعلقات گھریلو تعلقات میں تبدیل ہوجانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں لگتی۔ اس کا قیاس ہمیں ''تذکرہ مسّرت افزا۔ ص۔ ۱۷) میں بھی مل جاتا ہے کہ دونوں شعراء کے درمیان تعلقات محض رسمی یا ادبی نہ ہوکر خاندانی رہے ہو۔

حسرتؔ کا تخلص شروع سے آخر تک ایک ہی رہا۔ حسرتؔ نے شادی سے قبل شاید کہیں نوکری اور کسی قسم کی تجارت نہ کی تھی اسکا کہیں پر بھی کسی محقق نے ذکر نہیں کیا یہ ایک اور ثبوت ہے کہ حسرتؔ ایک اچھے گھرانے کے فرد رہے ہونگے۔ عموماً اُس دور

میں اگر والدین زندہ ہو اور خاندان صاحبِ ثروت ہو تو حسرتؔ جیسے نوجوانی کو فراغت ہی فراغت حاصل ہوا کرتی تھی۔ اگر وہ صاحبِ ثروت تھے اور والدین زندہ نہ ہوتے تب بھی یقیناً اُنہیں کسی نہ کسی طرح اپنی زمینیں، مال و دولت کی دیکھ بھال تو کرنی ہی پڑتی لیکن حسرتؔ کے نوجوانی کی عمر تک ایسا کچھ ہوتا کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ خود ان کے کلام میں بھی اس کے اشارے مل جاتے ہیں او جس طرح کی ان اشعار میں بخشگی پائی جاتی ہے اس سے اس بات کو فوقیت ملتی ہے کہ حسرتؔ نے نوجوانی تک بہت خوش حالی اور آسائشوں میں زندگی گزاری تھی۔

لیل و نہار زمانے کا ہے دیکھ نہ ہم کو چشمِ تر سے
تھے نہ سدا کے ہم ایسے ہی ہم بھی ثروت رکھتے تھے
عشق وجنوں کے دروں میں ہم بھی ایک اہلِ تشخّص تھے
منصب اور جاگیروں نقدی خدمت عظمت رکھتے تھے

ان کے یہ اشعار ان کی بچپن اور نوجوانی کی کئی یادوں کا اظہار نظر آتے ہیں۔ جن میں حسرت اور غمگینی کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی مقامات پر اپنے حالات کے بدل جانے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

اپنا احوال کبھی خوب نہ تھا ہے یہ غلط
کہ سدا ایک نہیں رہتا بشر کا احوال

جام کی گردش سے خالی تھا نہ ہاتھ ایک دور تھا
خونِ دل پیتے ہیں اب ہم گردشِ ایّام سے

میری بے برگ ونوائی چشمِ خواری سے نہ دیکھ

ایک دن تھا اس گلستاں کا گلِ سیراب میں

حسرتؔ اپنی پچھلی زندگی کو جس قدر حسرت سے یاد کرتے ہیں اُس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شاعر کا بچپن اور نوجوانی کس سکون ونشاط میں گزری ہوگی۔ یہ تو کچھ ایسی باتیں تھیں جو حسرتؔ کی ابتدائی زندگی سے متعلق تھیں ان کی شاعری میں اس کے جابجا اثرات ملتے ہیں۔ لیکن اُس دور کی تاریخ کی سب سے اہم تبدیلی نے اس شاعر کو اور اس جیسے کئی شعراء کو ایسا جھنجھوڑا مانوں ان لوگوں کو کسی نے آسمان سے اچانک زمین پر لا پٹکا ہو۔ اُس دور (۱۷۵۵ء) میں مسلم حکمرانوں کے تخت وتاج کو جس قدر دیمک کا گھن لگا تھا اس کی تاریخ گواہ ہے۔ شہامت جنگ، صولت جنگ، اور مہابت جنگ کے انتقال نے عظیم آباد اور اس کے اطراف واکناف کے علاقے کو اچانک ایسے حالات سے دوچار کر دیا جس میں ابتری کی انتہا ہوگئی تھی۔ حالات نے موڑ لیا اور اس کا اثر حسرتؔ پر بھی پڑا اور پہلی بار یہ شاعر ایک ایسی زندگی سے دوچار ہوا جس میں انھیں پیشہ حاصل کرنے کی جستجو میں بھٹکنا پڑا۔ ان کو ایک موقع پورنیہ میں نواب شوکت جنگ کے دربار میں نظر آیا۔ حزیںؔ خود بھی وہیں تھے۔ حسرتؔ نے موقع غنیمت جان کر نواب شوکت جنگ کے دربار میں حاضری دی۔ حسرتؔ کی یہاں خوب آؤ بھگت ہوئی لیکن شوکت جنگ کے شہادت کے بعد انہیں وہاں سے بھی جانا پڑا۔ یہاں کے قیام کا عرصہ چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ حسرتؔ نے بعد کو سراج الدولہ کے دربار میں حاضری دی، انھیں وہاں بھی وہی عزت ملی اور سراج الدولہ نے انہیں داروغگی اور عرض بیگی جیسے اونچے عہدوں سے سرفراز کیا۔ اسی زمانے میں حسرتؔ کو

اپنے رتبے اور بادشاہِ وقت سے قربت کی بنیاد پر ''ہیبت قلی خاں'' کا خطاب دیا گیا۔ اس سلسلے میں یوں کہا جاتا ہے کہ دربار میں حسرتؔ کا رعب اور دبدبہ اس قدر تھا کہ حسرتؔ کی ہیبت اور عہدے کو دیکھتے ہوئے ہی سراج الدولہ نے انھیں یہ خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ سراج الدولہ جب امراء وسلاطین کی سازشوں کا شکار ہوگئے تب حسرتؔ کو دوبارہ مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا۔ حسرتؔ کے پاس جو زمینیں اور گاؤں جاگیر کے تحت ملے تھا اُن پر بھی کسی اور نے قبضہ کر لیا تھا جس کے سبب انہیں بڑی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حسرت بعد میں مبارک الدولہ کے دربار سے بھی وابستہ رہے لیکن مالی تنگی تب بھی برقرار تھی۔ یہ (۱۷۸۰ء سے ۱۷۸۳ء) کی بات ہے۔ حسرتؔ کی زندگی یوں ہی مسائل وآلام کی نظر ہو چلی تھی۔ حسرتؔ نے عظیم آباد واس کے اطراف ہی اپنی زندگی گزاری۔ انھوں نے ''پورنیہ'' کا سفر اُس وقت کیا تھا جب حزیںؔ وہاں موجود تھے۔ بعد کو مرشد آباد میں آخری وقت تک قیام رہا۔ حسرتؔ کو عظیم آباد سے بے پناہ محبت تھی وہ اس کا ذکر اپنے کئی اشعار میں کر چکے ہیں۔

ہمیں یار و دیار اپنے سے تھی تقدیر میں دوری

غریبوں کو ستا مت آ کر اے یادِ وطن بس کر

ایک اور جگہ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

قفس میں ناامیدی سے ہمیں رہتا ہے اب یہ غم

بھلا دیں یا الٰہی دل سے ہم یادِ وطن کیونکر

جگہ خالی ہے دل کی یار کے ترک محبت پر

بھلا حسرتؔ کسی کے جی سے جا حُبِ وطن کیونکر

عزیز تم کو مبارک وطن کہ گردوں نے
جدا کیا ہمیں یار و دربار سے اب کے

حسرتؔ کی شاعری اُن کے داخلی کیفیات کی ترجمان ہے لیکن اس میں ایک بڑا فرق بھی ہے جو انہیں اوران کی شاعری کو دیگر شعراء سے الگ کرتا ہے وہ ہے ان کی مذہبی عقیدہ جو کہ ان کی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتا۔ کچھ کچھ آثار ملتے ضرور ہیں لیکن ان کے ذریعے کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ حسرتؔ شعیہ تھے یا کہ پھر سنّی۔ مذہب سے کتنی وابستگی رکھتے تھے اس کا کہیں کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا۔ ان کی شاعری بھی اس پر روشنی نہیں ڈال پاتی۔ حسرت کی شاعری کو پڑھنے پر احساس ہوتا ہے کہ اس شاعر کو نہ تو اسلام سے تعلق ہے اور نہ کفر سے لینا دینا۔ وہ بس اپنے اُس محبوب کے متلاشی ہیں جو کہ اُن کا منظور نظر ہے۔ جس کی خواہش ان کے اندر اس شدّت سے گھر کر چکی ہے کہ اُس کی یاد اور اُس کی بات کے بغیر اس شاعر کا زندہ رہنا ممکن نظر نہیں آتا۔ ان کے کلام میں ایسے جذبات ملتے ہیں جن میں ان کے قلبی وارداتوں کے علاوہ زندگی کے مسائل اور حالات کی یاسیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ وہ بیک وقت ہر شئے اور ہر اعتقادی نظریہ سے مبرّا ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی کی محبت میں اتنے جھک جاتے ہیں کہ مانوں گویا کوئی غلام اپنے آقا کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نثار کرنے تیار بیٹھا ہو۔ یہ حسرتؔ کے کلام کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ خوبی اس بنیاد پر کہ حسرتؔ نے ایسی شاعری کی جو اپنے دور سے بالکل ہٹ کر تھی۔ ان کی شاعری میں ایسے جذبات پوشیدہ ہیں جو اُس دور کے سماج کی ایک نئے زاویے سے نمائش کرتے ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے زمانے کی عین مطابق نہ تو تصوفانہ کلام موجود ہیں اور نہ ہی خدا کی

بارگاہ میں اپنے آپ کو پیش کرنے کا وہ انداز جو کہ اُس دور کے بیشتر شعراء کا شیوہ تھا۔ ان کے کلام کی خامی کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی شاعر کی شاعری ہی اُس کے ذہنی اور عقائدی افکار کا نمونہ سمجھی جاتی ہے اور حسرتؔ خود جس دور سے تعلق رکھتے تھے اُس دور میں صوفیانہ کلام اور شعیت کا بول بالا تھا ایسے میں اگر حسرتؔ مذہبی تناظر میں کچھ اشعار رقم کرتے تو اُن کی عقیدہ کو سمجھنے میں مدد ملتی لیکن اُن کے اشعار اس معمالے میں کسی قسم کی مدد نہیں کرتے۔ البتہ کچھ مقامات پر انہوں نے کچھ ایسے اشعار ضرور کہے ہیں جن سے اُن کی شعیت کی طرف جھکاؤ ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن یہ اشعار کوئی ثبوت نہیں کہ وہ شعیہ ہی تھے کیونکہ اُس دور میں عظیم آباد میں ایک عام رجحان تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ پر اشعار کہے جاتے۔ اس سلسلے میں کہے گئے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

بندہ و آزاد سے حسرتؔ مبرّا ہیں یہاں
ایک ہے ہم کو مگر مولائے حیدر سے امید

درد و غم سے دو دل نہ رہ حسرتؔ
تیرا ولی ہے شاہِ دلدل سا

سکندر اور خضر جانیں قدرِ آبِ حیات
ہمیں خاکِ درِ بو تراب سے نسبت

یقیناً یہ اشعار ان کی عقیدت اور محبت کے نمونے ہیں۔ لیکن اس سے حسرتؔ کا کوئی عقیدہ کھل کر سامنے نہیں آتا۔ اگر حسرتؔ انہیں اشعار پر اکتفاء کرتے تو شاید یہ

بات غالب آتی کہ حسرت شعیہ تھے۔لیکن انہوں نےکئی اسلامیہ اشعار اور ایک نعت بھی کہی ہے جس کا انداز انہیں شعیت سے الگ کر دیتا ہے۔اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل عمل ہے کہ حسرت کا اپنا عقیدہ کیا رہا ہوگا۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حسرت ایک ایسے مسلمان تھے جن کے پاس اپنے مسائل اور اپنی قلبی وارداتوں کو زیادہ اہمیت تھی۔ اس معاملے میں وہ کسی حد تک آزاد خیال بھی تھے وہ محبوب کے لیے اور غمِ یار و غمِ ہجراں میں کسی حد تک اسلامی حدود سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں۔

ہم عشق سوا کم ہیں کسی نام سے واقف
نہ کفر کے محرم نہ اسلام سے واقف

میں حسرت مجتہد ہوں بت پرستی کی طریقت کا
نہ پوچھو مجھ کو کیسا کفر ہے اسلام کیا ہوگا

ہم نہ جانیں کس طرف کعبہ ہے اور کیدھر ہے دیر
ایک رہتی ہے یہی اس در پہ جانے کی خبر

حسرت بعض جگہ اپنے محبوب کو اُس مقام پر لے آتے ہیں جہاں اسلام سوائے حق تعالیٰ شانہ کے کسی اور کو جگہ نہیں دیتا۔

دین و ایمان ہے سرو قدوں کی الفت
نا مسلمان ہے جو انکار کرے طوبیٰ کا

نیک و بد سے ہے مری خاطرِ ناشاد آزاد
غمگسار اپنا غمِ یار سلامت باشد

حسرت اور اُن کی شاعری کا ذکر مختلف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔جن تذکروں میں حسرت کا ذکر آتا ہے وہ کچھ یوں ہے۔''تذکرۂ شورش''،''تذکرۂ مسرت افزا''،''تذکرۂ گلشن سخن''،''تذکرۂ گلزارِ ابراہیم''،'تذکرۂ گلشنِ ہند یا تذکرہ حیدری''،''عمدۂ منتخبہ یا تذکرہ سرور''،''تذکرۂ عشقی''طبقاتِ شعراءِ ہند''تذکرۂ سراپا سخن''،''تذکرۂ سخنِ شعرا''،''تذکرۂ شمیمِ سخن''،''تذکرہ خمخانۂ جاوید''اور''مرزا جانِ جاناں''کے علاوہ بھی کئی ایسے تذکراتی نسخے موجود ہیں جن کے ذریعے حسرت اور اُن کی شاعری کی اہمیت و افادیت کو جانا جا سکتا ہے۔حسرت کی شاعری غور و خوض کی دعوت دیتی ہے۔

حسرت نے اپنی شاعری میں اپنے دور اور ذاتی وارداتوں کو اپنا تختِ مشق بنایا ہے۔شعرائے دلّی کی طرح اپنی شاعری میں یاسیت و المناکی کے اظہار کے لیے شدّت جذبات کا کبھی سہارا نہ لیا۔جس سے ان کی شاعری کو نیا لہجہ ملا۔ان کی شاعری میں متانت اور سادہ لوحی جھلکتی ہے۔یہ اثر 'مرزا مظہر' کی صحبت کے سبب ہے۔حسرت کی شاعری کا مزاج میر و درد کے طرز پر ستم و الم سے لبریز نہیں۔

عزیز تم کچھ اس کو کہو، ہوا سو ہوا
نپٹ ہی تند ہے ظالم کی خو ہوا سو ہوا

خطا سے اس کی نہیں نام کو غبارِ ملال
میں رو رو ڈالا ہے سب دل سے دھو، ہوا سو ہوا

انھوں نے اپنی شوقیانہ پن کو کبھی مبہم نہ رکھا۔جہاں کہیں اس کے اظہار کی ضرورت جانی بے تکلفی سے اظہار کرتے چلے گئے۔

ہے طلب ہم کو نمک اور ریزۂ الماس کی
کب کہاں ہم نے ہمارے زخم پر مرہم لگا

ہم سے کیا ایسا ہوا پیارے جو شرمانے لگا
ابتدائے عشق میں کیا جیو ترسانے لگا

کب مئے انگور کا ہو ذائقہ ایسا لذیذ
جیسا اس پستہ دہن سے بوسۂ لب ہا لذیذ

پریشاں بال اس کی زلف کے موئے کمر پر دیکھ
پر ادھر اک نگاہِ درو ہم بھی گاہ کرتے ہیں

حسرتؔ کی شاعری نہ تو دلّی کی ہے اور نہ ہی لکھنؤ کی۔ بلکہ ایسا امتزاجی نمونہ ہے جس میں یاسیت کے ساتھ گدازیِ نشاط کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ یہ بات سننے میں عجیب لگتی ضرور ہے لیکن اس کے تاریخی پہلو پر غور کریں تو وضاحت مل جاتی ہے۔ حسرتؔ نہ تو دلّی والے تھے اور نہ ہی وہ لکھنؤ کی سرزمین کے باشندے تھے۔ انہوں نے عظیم آباد میں پرورش پائی جو کہ نہ تو دلی کی طرح مکمل اُجڑا اور نہ ہی لکھنؤ کی طرح نشاط میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس علاقہ میں اعتدال بھری زندگی تھی جس میں کہیں نشاط تو کہیں حالات کا سامنا ہو جاتا تھا۔ اور یہی چیز حسرتؔ کی شاعری میں مفصل طور پر ملتی ہے۔

محبوب اور اس سے عشقیہ گفتگو شاعری میں کوئی اہم بات نہیں۔ ہر شاعر اپنے انداز میں کہتا چلا جاتا ہے۔ حسرتؔ کا محبوب ان کے لئے دنیا سے نرالا ہے۔ ان کا محبوب بڑے ناز و نعم کا پلا ہے۔ وہ حقیقی دنیا سے کم اور آسمانی دنیا سے زیادہ متعلق ہے۔ شاعر کو محبوب کے دیدار بڑی محنت اور جفا کشی سے نصیب ہوتا ہے۔ حسرتؔ

محبوب کی دلجوئی، اس کے حسن کی تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر اسے مناتے اور اپنی جانب راغب کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا محبوب اپنے عاشق سے مبرّا ہے۔ اُسے عشق سے تو پیار ہے لیکن عاشق کی اہمیت کچھ نہیں۔ عاشق کا مقام روایتی ہے۔ ان کا معشوق اپنی جلوہ نمائی ہر جاہ، ہر موقع نہیں کرتا اس جلوہ نمائی میں ایک نازک خیالی، نازک مزاجی، ناز برداری، ناز دانہ اور ناز و نیاز کے ساتھ ساتھ خود پر نازیدنی، کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنی شاعری کے اس انداز پر خود حسرتؔ بھی نازاں ہیں۔

حسن کو شوخی ہے لازم اتنا مت رہ پُر حجاب
تو نے کس استاد سے بتلا یہ سیکھا ادب

انھیں محبوب کو ویسا ہی دیکھنا پسند ہے جیسی ان کی خواہش ہو۔ وہ اپنے محبوب کی برائی میں ایک لفظ سننے کے روادار نہیں۔ انھیں اپنے محبوب سے آخری درجہ کا عشق ہے۔ اگر کوئی انھیں نصیحت کرتا بھی ہے تو ان کے پاس ایک ہی جواب ہے۔

دم لے اے ناصح رکھ اپنے یہ لبِ اظہار چپ
مجھ سے اے بے ہودہ گو زیادہ نہ کر تکرار چپ

میں نہیں دم مارتا پر شور دل کو کیا کروں
اے ترے قربان رہ سکتا نہیں بیمار چپ

جستجوِ عشق اور حاصلِ عشق ہی حسرتؔ کی شاعری کا مظہر ہے۔ ان کی ابتداء بھی محبوب اور انتہاء بھی محبوب۔ وہ نہ تو کسی اور شئے کے طلب گار ہیں اور نہ ہی کسی اور شئے میں لذتِ نفس پاتے ہیں۔ عشق کے لیے دربدر پھرنا اور اسی کی تمنا ان کی شاعری کا خاصّہ ہے۔

یا الٰہی مرا دلدار سلامت باشد
وہ ولی نعمتِ دیدار سلامت باشد
قتل عاشق کے تئیں گو ہووے یک شہر گواہ
وہ ترا ناز سے انکار سلامت باشد

محبوب کے بے التفاتی پر کسے غم نہیں ہوتا۔لیکن شاعر کی خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ اس بے التفاتی کے ہزاروں وجوہات تلاش کر کے اپنے دل کو سمجھا لیں۔ یہیں عمل حسرتؔ کے پاس نمایاں طور پر ملتا ہے۔محبوب کی بے توجہی سے انھیں کوئی اعتراز نہیں ۔ وہ محبوب کے اسقدر عاشق ہیں کہ اس کی ہر ایک ادا ان کے لیے خوبصورت اور جہاں آفریں ہے۔

دل نے ترکِ بے خودی کی بات کب مانی ہنوز
ہے قدم گاڑے وہی آنکھوں میں حیرانی ہنوز
سدھ سنبھالے پر ہو شاید غور اسے اس بات پر
قدر میری ان نے طفلی میں نہیں جانی ہنوز

محبوب کی بے توجہی کا کس پر اثر نہیں ہوتا۔حسرتؔ کے پاس یہ عنصر بہت مدہم ہے لیکن ہے ضرور۔

یار آتا نظر نہیں آتا
ہم کو ہوتا نہ انتظار اے کاش
اس قدر وصل کی نہیں ہے تلاش
ملے اغیار سے نہ یار اے کاش

عشق فطری عمل ہے جس کے لیے حسرتؔ رسوائی اور خواری کو بھی بخوشی قبول کرتے نظر آتے ہیں۔

۱)

بے ذوق جینا عشق سے پھیکا نرا رکھے
یاں چاہئے کسی سے کوئی دل لگا رکھے

۲)

یہ عشق کی خواری شرفِ شاہ و گدا ہے
عاشق نہ ہووے گا کہ وہ خوار نہ ہوگا

انھیں اپنی ذلّت وخواری کا افسوس ہوا بھی تو بہت ہلکا سا۔کیونکہ ان کے لیے جذبۂ عشق ہی سب کچھ ہے۔

سوائے عشق کے نہ تھا اور کام کیا حسرتؔ
عاشق نہ ہووے گا کہ وہ خوار نہ ہوگا

میری قسمت میں لکھی عشق کی بدنامی تھی
اپنی خواری بھی عزیز و کسو کو بھاتی تھی

ان کے پاس عشق ایک ایسے نظریہ کا نام ہے جو انسانی فطرت کو بلند مرتبے کی طرف گامزن کرتا ہے۔ان کے اشعار کہیں پر بھی جنسیت کے اثیر نہیں ہوئے۔وہ محبوب سے عشق کرتے ہیں اور بدلے میں انھیں بھی عشق ہی مطلوب ہے۔ان کی شاعری کا کوئی حصّہ نفسانی خواہشات کا اظہار نہیں کرتا۔محبوب کے دیدار، اس کی

قربت، اس سے گفتگو، اسے دور سے سراہنا ہی ان کا مقصد شعر بن کر ابھرتا ہے۔ حسرتؔ بطور عاشق اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتے اور نہ ہی کسی اور کو اس کی اجازت دیتے ہے۔ عشق جیسے پاکیزہ جذبے کو وہ کسی سطحیت کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

ہے رشکِ وصل سے غمِ دلدار ہی بھلا
راحت سے ایسی ہم کو دو دل آزار ہی بھلا

کر اک نگاہِ دور پہ تک چند اکتفا
حسرت نہیں ہے عشق میں بوس و کنار فرض

عشق میں ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب معشوق کو عاشق سے دوری اختیار کرتے ہوئے مزا آتا ہے۔ وہ عاشق کی تڑپ اور بےچینی سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔۔اسے عالم نزاع کی کیفیت میں دیکھ نشاط حاصل کرتا ہے۔ عموماً یہ جذبہ ابتدائی عشق میں ہوتا ہے جو کہ انتہاء سے بالکل دور اور خواہش لذت و آشنائی کے علاوہ وصال کا مطلوب ہوتا ہے۔ حسرتؔ کے پاس اس قسم کے عشق کا روایتی انداز بدجہ اتّم موجود ہے۔

وہ شوخِ حیلہ باز و بہانہ طلب ہے اب
جو التفات ہم سے تھا اس کو وہ جب ہے اب
رہتی تھی تم کو مہر و وفا کی بہت طلب
کیوں ہم سے اتنا جنگ ترا بے سبب ہے اب

عشق انسان کے لیے ایسی دنیا کی نمود کرتا ہے جس میں التفاتیت کے ساتھ ساتھ بےچینی کا عالم دامن گیر رہتا ہے۔ اس دنیا میں نشاط و استنباط کے علاوہ بےچینی انسان کو زمین پر بیٹھنے نہیں دیتی۔ ایک ہو کا عالم دل و جاں میں رچ بس جاتا ہے۔ محبوب کی یاد، اس کی جستجو اور خواہش دیدار اتنے شدید جذبات ہوتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا محال ہوتا ہے۔ ایسے میں بدگمانی سر اٹھاتی ہے۔ یہ بدگمانی اس قدر قوی جذبہ ہوتا ہے جس سے فرار عاشق کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسے وقت میں انسان وہ باتیں سوچتا چلا جاتا ہے جس کا نہ تو سر ہوئے نہ پیر۔ بس احساس بےبسی انسان سے وہ کچھ کہلوا دیتی ہے جو اس کی فطرت سے پرے اور جذباتیت سے پُر ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کسی شاعر کے پاس اُسی وقت ملتی ہے جب اُس کا واستہ ان کیفیات سے واقعتاً پڑا ہو۔ حسرتؔ اس سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔

کسی کو سہل ہے کاٹے اگر زمین کا سانپ
خدا کرے نہ ڈسے زلفِ عنبریں کا سانپ
ہے میرے دل کو گلو گیر اس کی زلف کی یاد
گلے میں ڈالتے ہیں جیسے یاسمین کا سانپ
میں کس فسوں سے بچوں اس رقیبِ موذی سے
ہمیشہ قصد میں ہے میرے کمین کا سانپ

اسی بےکیفی کے عالم میں وہ خود کلامی بھی کرتے نظر آئے۔

ہرگز اس کو نظرِ لطف نہیں میرے پر
مہرباں کیوں نہیں وہ زہرہ جبیں میرے پر

خاکساروں سے بھلا اتنی بھی بے روئی کیا
تنگ آیا ہے میاں روئے زمین میرے پر
جس طرح پاتا ہے مغلوب کوئی اپنا غنیم
غارتِ عشق ہے ملکِ دل و دیں میرے پر

حسرتؔ، عشق میں نشاط کا جو منظر نامہ پیش کرتے ہیں وہ دیگر شعراء سے کسی قدر مختلف نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ساغر و جام سے اپنی نشاطیہ کدورت کی تسکین نہیں کرتے بلکہ اپنے خوشی اور تسکین کی خاطر جدوجہد اور محنت کو مقدم جانتے ہیں۔ انہیں نشے کے لیے مے خانے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لیے خونِ جگر درکار ہے۔

محبت کے نشے کو مے خانے سے کیا نسبت
پئیں جو خونِ دل ان کو پیمانے سے کیا نسبت

ظاہر ہے نشاط کے لیے ایسی کیفیات عموماً روایت سے ہٹ کر نظر آتی ہے۔ حسرتؔ اسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے اسی لیے آگے وضاحت بھی کر دی۔

نہ حسرتؔ کی نصیحت میں کرو اوقات کو ضائع
تمہیں اے عاقلو ہے ایسے دیوانوں سے کیا نسبت

حسن کو جب اپنی اہمیت کی آشکاری ہوتی ہے تب اُسے جس قسم کا غرور آتا ہے اس کی مثال نہیں ہوتی۔ اس حسن والے کے لیے سارے عاشق یکساں ہوتے ہیں بجز اُس کے جو مکمل طالب ہو۔ اُسے اپنے لیے منتخب کرنے والے تو بہت سے ہوتے ہیں۔ حسن کا اپنا انتخاب ہی اصل وصل کا ضامن ہے۔

ترے شمائل موزوں میں ہیں ادائیں خاص
ہے ایسے حسن کو کیا انتخاب سے نسبت
وہ خام سوزِ محبت سے ہے مگر غافل
ہمارے دل کو جو دے ہے کباب سے نسبت

اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی ان کا محبوب بہت معصوم اور پیارا ہے۔ اس کی معصومیت ایسی ہے کہ جس کے لیے طفل سے بہتر کوئی لفظ شاعر کے پاس نہیں۔

دل اس کے ہاتھ دیا ہم نے کی یہ نادانی
وہ طفل ہے اسے کیا ہے کتاب سے نسبت

محبوب سے لطف عنایت کی خواہش میں وہ عجز یہ گفتگو سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے پاس عشق اور معشوق ہی سب کچھ ہے۔ اگر معشوق انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھتا تب آخری حربے کے طور پر اُس سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

دیکھیں نہ تجھے نہ آویں کے ہم
کہنا نہیں کر دکھاویں گے ہم
یہ جور کوئی اٹھاوے کب تک
اُٹھ در ہی سے تیرے جاویں گے ہم
تو قطع نظر تو ہم سے کر دیکھ
نظروں سے تجھے گراویں گے ہم
تاب تو اس کی جفاؤں کی کسی طرح
حسرتؔ اب تو نہ لاویں گے ہم

اسی طرح جب ناکامی عشق ہو چکی ہوتی ہے۔ان کے پاس اُس معشوق کی وہ اہمیت نہیں بچتی جس کے لیے سب نثار کر چکتے ہیں۔

خوبروئی کا تو ہے کیوں نہ مایہ اس کو
پر جو کچھ سنتے تھے اتنا تو نہ پایا اس کو
گھر جلا اوروں کا دیکھو ہو تماشا تم واہ
تم نے اے دیدہ و دل مجھ بتایا اس کو

الغرض حسرتؔ کی شاعری اُن کی داخلی کیفیات کا آئینہ ہے۔ان کی حالات زندگی اپنے دور کی نمایاں عکاسی ہے۔ان کی غزلیں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ دلّی کی یاسیت اور لکھنؤ کے نشاط کا بہترین امتزاج ہے۔ان کے پاس رومانیت کو پاکیزگی اور حالات زمانہ کو حقانیت حاصل ہے۔وہ حالات کے ستائے ہوئے تو ہیں لیکن انھیں بہتر زندگی کے مواقع بھی میسر آئے۔ان کی شاعری میں دونوں ہی کیفیات کی چشیدنی ملتی ہے۔اپنی شاعری میں ہمیشہ فطرتی عوامل کو جگہ دیتے ہیں اور چغالی سے اجتناب کرتے نظر آتے ہیں۔

☆

سرورؔ جہان آبادی کی شاعری میں ہنودی کردار

سرور جہان آبادی کا اصل نام ''درگا سہائے'' تھا۔منشی پیارے لال کے گھر ۱۸۷۳ء کو مسیحی آباد، قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے ذی حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان' کائیست' تھا۔اس علاقہ کی اپنی تاریخ رہی۔لیکن اکبر کی اس شہر پر خصوصی توجہ کے بعد اس کی تاریخی نگاہ سے کچھ اور اہمیت ہوگئی۔

سرور کا گھرانہ اکبر کے آنے سے قبل ہی سے یہاں آباد تھا۔ان کا خاندان علم وحکمت کے لیے تمام علاقے میں مشہور تھا۔کائیست بنیادی طور پر ہندوؤں کا ایسا طبقہ تھا جو بہت تعلیم یافتہ اور دنیاوی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھے۔ان کا مزاج بھی عام ہندوں طبقے سے مختلف ہوا کرتا تھا۔یہ طبقہ دیگر اقوام کے ساتھ گھل مل کر رہا کرتا تھا۔حکومتوں میں انھیں اعلیٰ عہدے حاصل تھے۔سرور کے والد پیارے لال پیشے سے ایک طبیب اور حکومتی نمائندہ تھے۔سرور منشی پیارے لال کی چوتھی اولاد تھے۔ان کا

بچپن بڑی خوشحالی میں گزرا۔ والد کی خصوصی توجہ کے باعث بہترین تربیت پائی۔ پیارے لال نے سب کچھ ہونے کے باوجود کبھی اسراف نہ کیا اور یہی تربیت اولاد کو بھی دی۔

سرور کے بچپن کا بیشتر حصہ کھیل کود میں گزرا۔ والد ایک باشعور انسان تھے۔ جانتے تھے کہ اولاد کی تربیت میں کھیل کود بھی شامل ہے۔ سرور نے کئی جگہ اپنے بچپن کا ذکر کیا ہے۔ جس میں وہ کبھی لکڑی کے گھوڑے کی سواری کرتے تو کبھی پتنگ بازی سے شغل کرتے۔ بہنوں کے ساتھ ریت کے گھروندوں کی تیار کرنا اور بھائیوں کے ساتھ گیند کھیلنے جانا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

کیچڑ میں کھیل کر گلیوں میں لوٹ جانا
اور میرے ہم سفوں کا قہقہے لگانا
شانہ پکڑ کے میرا آہستہ پھر اٹھانا
لت پت وہ گھر کو آنا وہ ماں کا مسکرانا

موسمِ باراں میں اپنے علاقے کا جل تھل ہو جانا اور سرور کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس میں کاغذ کی کشتیوں کو بہانا ایسے قصے ہیں جنھیں وہ کبھی بھلا نہ سکے۔

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں میں بنالوں
چھوٹی سی کشتی اپنی پانی میں بہالوں
طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گالوں
پھر بانسری بجالوں پھر جھنجھنا بجالوں
دو دن کی جوانی دے اُدھار بچپن

سرور کو سن بلوغت میں ان کیفیات کا بخوبی تجربہ ہوا جو ایک نوجوان کو ۱۴ سے ۱۶ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ فارغ البالی نے انھیں عشق و حسن سے آشنا کیا۔ والد کی بہترین تربیت اور خود کی ذہنی پاکیزگی نے انہیں بجائے بے راہ روی کا شکار ہونے کے شاعری کی طرف راغب کیا۔ شاعری کے مطالعے نے ان کے مزاج اور شعور کو پختہ کیا۔

کبھی تھا کوئل کا ہم نوا میں کبھی تھا میں ہم سرود قمری
چمن میں کرتا تھا چھیڑ پہروں میں جا کے مرغانِ نغمہ خواں سے
کبھی شگوفوں کو چومتا تھا، کبھی تھا کلیوں کو پیار کرتا
نثار میں بھی تھا آہ! بلبل ادائے گل پر ہزار جاں سے

ان کی ابتدائی تعلیم والد کے زیرِ نگیں ہوئی۔ ان کے والد پیارے لال خود بھی اُردو اور فارسی کے فاضل تھے۔ ان کی اُردو اور فارسی کی بنیادیں والد ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی تناظر میں انہوں نے سنسکرت بھی پڑھی۔ منطق، ریاضی، طبّ جیسے علوم سے بھی واقفیت حاصل کی۔ اُس زمانے میں عام رواج تھا کہ لسانی علم میں پختگی کی خاطر بچوں کو مختلف شعراء کے کلام سکھائے جاتے۔ سرور کو یہیں سے شعر گوئی کا چسکہ لگا۔ جو آگے چل کر ایک پختہ اور مکمل شاعری کی شکل میں سامنے آیا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ انھیں علم کی بڑی چاہ تھی۔ انہوں نے اُردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ بچپن ہی میں کر لیا تھا ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ بھی پڑھی۔ مڈل اسکول میں داخلے کے بعد انھیں ’مولوی کرامت حسین بہادر بریلوی‘ جیسے جیّد عالم کی صحبت میسر آئی۔ یہ حضرت عربی اور فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ ان ہی کی

تربیت کا نتیجہ رہا کہ سرور کو مذہب سے باجود تعلق کے کبھی اونچ نیچ، یا ہندو مسلم میں فرق محسوس نہ ہوا۔ ان کی شاعری میں بھی گنگا جمنی تہذیب کی بڑی اہمیت ہے۔ تصوف سے انھیں خاص تعلق تھا۔ وہ اسے ہندوستانی تہذیب کا امین جانتے تھے۔

سرور کے والد کو ان سے خاص تعلق تھا۔ وہ ان کی ذہانت کے شیدا تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ لیکن سرور کو گھر چھوڑنا قطعی منظور نہ تھا۔ انہوں نے ۱۹۰۷ء میں مڈل اسکول سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد والد کے اسرار پر بھی کہیں باہر تعلیم کی غرض سے جانا منظور نہ کیا۔ البتہ تعلیم کے شوق کے سبب علاقہ کے پوسٹ ماسٹر ''منشی شب سُہائے'' سے انگریزی کی تعلیم لینی شروع کردی۔ اور ۲ سال بعد مڈل امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ انگریزی سیکھنے کی لیے انہوں نے انگریز شعراء کے کلام کا ہی سہارا لیا اور اچھی خاصی انگریزی سیکھ لی۔ سرور کو مغرب کے بہت سارے شعراء کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ وُرڈ بھ، کیٹس، شیلی، براؤننگ وغیرہ جیسے شعراء کا گہرائی سے مطالعہ کر چکے تھے۔ ان شعراء سے متاثر ہو کر انھوں نے چند نظمیں بھی کہی ہیں۔

سرور گھر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور علاقے میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اب ان کی بے چین فطرت نے اپنی تسکین کی خاطر انھیں علم طبّ کی طرف متوجہ کیا۔ چونکہ والد خود علاقے کے بڑے طبیب تھے اس لیے یہاں پر بھی ان کی تعلیم کے لیے وہی بحثیت استاد مقرر ہوئے۔ اُس زمانے میں علم طب کی تمام معلومات سنسکرت میں ہوا کرتی تھی اسی لیے سرور نے سنسکرت کو بڑے چاؤ سے پڑھا۔ ان کی ذہین طبع نے انھیں علم طب میں اس قدر ماہر کر دیا کہ وہ اپنے والد کے بعد علاقے کے

سب سے مشہور طبیب مانے جاتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف آیوروید بلکہ یونانی طب علاج کو بھی سیکھ لیا۔ ان کے علم اور خلوص دل نے ان کے ہاتھوں میں شفا بخش دی۔ ''سرسام'' اور ''دق'' جیسی بیماروں میں ان سے بہتر معالج پورے علاقے میں کوئی اور نہ تھا۔ خود ان کے والد ان سے کئی بار رائے مشورہ کیا کرتے تھے۔

سرور کی شادی محض ۱۷ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ بیوی کا نام ''شنکر دیوی'' تھا۔ سرور صحیح معنوں میں ان پر فریفتہ تھے۔ ان کا گھر چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے نہ جانے کا سبب بیوی کی محبت ہی تھی۔ سرور کا اپنی بیوی سے چاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ انھیں نام سے پکارنے کے بجائے انھیں ''دیوی'' کہہ کر پکارا کرتے۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ ''شنکر دیوی'' سچ میں ایک دیوی ہے۔

شنکر دیوی بے حد حسین تھیں۔ ساتھ ہی ان کی بذلہ سنجی کے سرور اسقدر قائل تھے کہ کوئی کام بغیر ان سے پوچھے کبھی نہ کرتے۔ شنکر دیوی سرور کا ہمیشہ خیال رکھتیں۔ ان کی ہر ضرورت کا پہلے ہی سے انتظام کر دیا کرتیں۔ سرور کو انکے یہ اعمال اتنے پسند تھے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ان کے تمام حسن واخلاق کو پیش کیا ہے۔ نظم 'زن خوش خو'' میں انہوں نے اپنی والہانہ چاہت اور اہلیہ کے حسن واخلاق کو پیش کیا۔

بہتر نہیں غم خوار زنِ خوب و نکّو سے
گھر سارا مہک اٹھتا ہے اس پھل کی بو سے
آجاتا ہے نور آنکھوں میں آئینہ رو سے
مٹ جاتی ہے قسمت کی سیاہی شبِ مُو سے

چہرے میں ترِ زلف جو ہے بدر کا عالم
پھر جاتا ہے آنکھوں میں شبِ قدر کا عالم
شوہر کی زنِ نیک جو ہو مونس و دل سوز
بھونرا سی بھی کالی ہو تو شمع دل افروز
تاکید جو پردے کی حیا کو ہے شب و روز
ہوتی نہیں گستاخ نگاہِ ادب آموز
پہرے پہ ہے عصمت کوئی بیگانہ آئے
فانوس پر اُڑ کر کوئی پروانہ نہ آئے
انداز بھی ہے، ناز بھی، عشوہ بھی، ادا بھی
صورت میں پری چہرہ بھی ہے حور لقا بھی
آنکھوں میں مروت ہے نگاہوں میں حیا بھی
حسن اس کو جو قدرت نے دیا ہے تو وفا بھی
شوہر کو غرض مایۂ آسایش جاں ہے
وہ قالبِ بے جان ہے تو یہ روح رواں ہے

۱۸۹۷ء میں ان دونوں کو ایک اولادِ نرینہ ہوئی۔ جس کے بعد سرور کی زندگی کا محور یہ دونوں بن گئے تھے۔ سرور کا دل اگر ان دونوں کے علاوہ کہیں اور لگتا تو وہ صرف شاعری تھی۔ شنکر دیوی نے اپنے بچے کا نام ''واسدیو'' رکھا۔ ان دونوں کی خاطر سرور نے ۸ برسوں تک اپنے علاقے کو نہ چھوڑا۔ والد کے اسرار اور ضروریات خانہ داری کے سبب انہوں نے ملازمت کی ٹھانی۔ انہیں مال و دولت کی یوں بھی چاہ نہ تھی۔

ضروریات زندگی کے لئے ملازمت کے خواہاں تھے۔ ملازمت کی خاطر وہ میرٹھ، ہلدور، نہوڑ، کانپور وغیرہ جاتے رہے۔ ان کی تمام ملازمتیں محض ضروریات ہی تک محدود رہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرور کی شاعری باضابطہ طور پر علاقے کے مشہور رسالوں اور اخبارات ''کائستھ ہتکاری، آریہ سنویشی، اور انیس ہند'' میں شائع ہوا کرتی تھیں۔

۱۸۹۷ء میں ایک مشہور شاعر ''لیکھر ام آریہ مسافر'' کا انتقال ہو گیا۔ سرور ان کی شاعری کو پسند کیا کرتے تھے۔ اپنے قلبی حالات کو انہوں نے رباعیات کی شکل میں ڈھال کر ''انیس ہند'' اخبار کو بھیجے۔ ان کی رقت آمیز رباعیات نے سبھی کا دل چھو لیا۔ اس اخبار اور ''ودیا درپن میرٹھ'' (جو کہ ایک مطبع خانہ تھا) کے مالک ''رام چند دلیش'' نے اسی سال کے مئی ماہ میں انھیں دعوت دی کہ وہ اخبار سے منسلک ہو جائے۔ سرور کے اس ملازمت کو قبول کرتے ہی انہوں نے اخبار اور مطبع خانے کو مکمل طور سے ان کے حوالے کر دیا۔ یہ سرور کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ سرور نے اس ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے اپنی شاعری پر خاص توجہ کی۔ بیوی اور بیٹے کے پاس نہ ہونے اپنی تمام بے چینی کو وہ شاعری کے ذریعے دور کیا کرتے تھے۔ ان کے اشعار اسی اخبار میں بڑی پابندی سے چھپنے لگے جس کے باعث انھیں کافی شہرت ملی۔ اسی کام کے دوران وہ کئی بڑی شخصیات متعارف بھی ہوتے رہے۔ سرور نے یہاں محض چند ماہ گزارے ان کا یہاں دل نہ لگتا تھا۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں اس ملازمت سے سبکدوشی اختیار کر لی۔

ملازمت کی سبکدوشی کے بعد انھیں ''لالہ ڈال چند رئیس ہلدور''، ضلع بجنور

کے والی نے اپنے یہاں رہ کران کے فرزند ''دولت چند'' کی تعلیم کی دعوت دی۔ جسے سرور نے قبول کرلیا۔سرور نے اس لڑکے کی ایسی تربیت کی کہ وہ چند ماہ کے اندر ہی شعرشاعری کرنے لگا۔آگے چل کرسرور کی وفات پرایک مرثیہ بھی لکھا۔سرور جب تک ہلدور میں رہے وہ بڑی پابندی سے اپنا کلام شائع کرواتے رہے۔ہلدور کی ایسی کوئی شعری مجلس نہ ہوتی جہاں سرور حاضر نہ رہتے۔اسی بیچ وہ ہفتہ دو ہفتہ میں گھر کا چکربھی لگالیا کرتے انھیں بیوی اور بچے کی یاد بہت بے چین کیے رہتی تھی۔اسی بیچ راجہ لالہ ڈال چند کے دوست ''راجہ صاحب نہوڑ'' ان سے ملاقات کی غرض سے آئے اور سرور سے مل کران کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔انہوں نے لالہ ڈال چند سے درخواست کی کہ وہ سرور کونہوڑ بھیج دیں۔دوست کے اسرار پرانہوں نے سرور سے درخواست کی اور سرور کومحض اخلاقی تقاضوں کے سبب نہوڑ جانا پڑ گیا۔ وہ اس سے بالکل خوش نہ تھے۔

نہوڑ آئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ انھیں اہلیہ کی علالت کی خبر ملی۔اس خبر نے انھیں بہت بے چین کردیا۔انھوں نے راجہ صاحب نہوڑ سے رخصت لی اور جہان آبادلوٹ آئے۔گھر آنے پرمحسوس کیا کہ شنکر دیوی کی طبعت بہت نازک تھی۔وہ فوری علاج وتیمارداری میں جُٹ گئے۔اہلیہ کی نازک حالت اور واسدیو کی ۲ برس کی عمر نے انھیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔شنکر دیوی کی حالت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی اور ۱۸۹۹ء کے اختتامی مہینے میں وہ چل بسی۔سرور کو ایسا صدمہ لگا جس سے وہ کبھی اُبھر ہی نہ پائے۔وہ دنیا جہاں سے بیگانے ہو گئے۔انہوں نے مےنوشی شروع کردی۔دن رات شراب کے نشے میں مدہوش رہتے اور واسدیو کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے۔

اُسے ایک لمحے بھی خود سے جدا نہ ہونے دیتے۔ان پر یہ کیفیت تقریباً تین سال تک رہی۔اس بیچ انہوں نے ایک شعر بھی نہ کہا۔۱۹۰۳ء میں انہوں نے جب دوبارہ شعر گوئی شروع کی تن بھی انھیں یہ سانحہ یاد تھا۔پہلی بار ان کے اندرونی کرب نے تحریر کی شکل اختیار کی۔

کب تک صدائے پیہم یہ نالہ و فغاں کی
آخر ہے انتہا بھی تیرے غم پنہاں کی
چوٹیں جگر پہ کب تک آندوِجاناں کی
فریاد آہ سن لے مجھ زار و خستہ جاں کی
تیری طرح ہوں اُف اُف فرقت نصیب میں بھی
کھوئے ہوئے ہوں یعنی اپنا حبیب میں بھی

جس طرح لوٹتا ہے تو درد جا نستاں سے
ہوں بیستوار میں بھی یو نہی غم نہاں سے
حسرت ٹپک رہی ہے دونوں کی داستاں سے
دونوں کی یار دلبر رخصت ہوئے جہاں سے
راہی ہوئے عدم کو دونوں کے یار جانی
چھیڑوں میں قصّہ غم تو ہجر کی کہانی

سرور کی زندگی کا دوسرا بڑا سانحہ ان کے لختِ جگر کی وفات رہا۔۱۹۰۵ء میں سرور کی مالی حالت ٹھیک نہ تھی۔انہیں مجبوراً تلاش معاش کے لیے جہاں آباد کو چھوڑنا پڑا۔انھوں نے اپنے لخت جگر کی ذمہ داری اپنے خاندان والوں کے سپرد کی اور

ملازمت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ سرور کو ''زمانہ کانپور'' میں ادارت کی نوکری مل گئی۔ ''زمانہ کانپور'' سے وابستہ ہوئے ایک سال کا وقفہ بھی نہ گزرا تھا کہ انھیں واسدیو کی بیماری کا علم ہوا۔ سرور فوری جہان آباد چلے آئے۔ گھر آنے پر پتہ چلا اُسے نمونیہ ہو گیا تھا۔ سرور نے پوری توجہ سے اپنے لختِ جگر کی تیمارداری شروع کردی۔ کہا جاتا ہے کہ اس عرصے میں انہوں نے کبھی شراب کو چھوا تک نہیں۔ ان کی تمام تر کوششیں بے کار گئیں اور واسدیو بھی انھیں چھوڑ کا چل بسا۔ یہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس سے ابھرنا ان کے لیے بے حد مشکل امر تھا۔

پہلے بیوی اور اب بیٹے کی موت نے انھیں پوری طرح توڑ کر رکھ دیا۔ کہاں یہ شاعر جو اپنے علم طب کی وجہ سے سارے علاقے میں مشہور تھا کہ وہ موت کے منہ سے مریض کو کھینچ لاتا ہے، اپنے دونوں عزیز گنوا بیٹھا۔ سرور کی تمام خواہشات اور آرزوئیں ختم ہوگئی۔ سرور جب اپنے لختِ جگر کو آگ دیکر لوٹ رہے تھے انھوں نے راستے ہی میں اپنے ایک دوست ''منشی عبداللہ خان'' کے مکان پر بیٹھ کر اپنے کرب و الم کو شاعری کے ذریعے بیان کر دیا۔ یہ اشعار بطور لوری کے لکھے گئے۔ اس کے ذریعے اس شاعر کی قلبی بے بسی اور رنج والم کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ نظم ''دل بے قرار سوجا'' اسقدر مشہور ہوئی کے علاقے بھر کی مائیں اپنے بچوں کو روزانہ اسے سنا کر سلایا کرتی تھیں۔

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سوجا
کہ گزر گئی شب آدھی، دل بے قرار سوجا
یہ نسیم ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے

تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غم گسار سوجا
یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کردے
مرے پردہ دار سوجا مرے راز دار سوجا
مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دمبدم تڑپنا
ترے غم میں آہ! کب سے ہوں میں اشک بار سوجا
ابھی دھان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ! شیوہ نہ کر اختیار سوجا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھالوں
تجھے سینے سے لگالوں، تجھے کرلوں پیار سوجا
تجھے جن کا ہے تصور ارے مست جام الفت
انھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا

سرور کو اس کے بعد بلا کی مے نوشی کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ ان کے پاس سوائے شراب اور شاعری کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ شراب بدل اکثر اپنے اشعار لوگوں کے نام کر دیا کرتے تھے۔ ان کے دوستوں میں سے اکثر سرور کی شراب کی ضرورت پوری کرنے کے بہانے ان سے کچھ نہ کچھ لکھوا کر اپنے نام سے اخبار یا رسالوں میں شائع کروالیا کرتے تھے۔ اس شاعر نے اولاد کے وفات کے بعد محض تین سے چار سال کی حیاتی پائی۔ ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو علی الصبح سرور جہان آبادی کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔

سرور کی شاعری کا دور ۱۹ صدی کے آخر اور ۲۰ صدی کے آمد کا دور رہا۔ اس

زمانے میں حالات بڑی شدت سے کروٹ بدل رہے تھے۔ ملک بھر میں سیاسی اور مذہبی تحریکیں چل رہی تھی۔ ملک کی بقا اور انگریزی حکومت کے ظلم و زیادتی کے خلاف پرچم بلند کرنے کے کوششیں کی جا رہی تھی۔ ایک طرف نثر کے لیے جدید اور سادہ زبان کو استعمال کیا جا رہا تھا تو وہیں شاعری کو سماجی تقاضوں سے منور کرنے کے جدوجہد جا ری تھی۔ شاعری کو جدید پیرائے سے مزین کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ جدید شاعری کے ابتدائی نقوش سرور جہان آبادی کے پاس جا بجا مل جاتے ہیں۔

سرور کی شاعری میں سیاسی، اقتصادی، معاشی، سماجی، ادبی، مذہبی، فلسفیانہ خیالات سبھی کچھ موجود ہے۔ ان کی قلبی وارداتوں کی کیفیات بھی حالاتِ زمانہ سے مبرّا نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ ان کی زندگی کی مسلسل جدوجہد اور مصائب و آلام سے نبرد آزمائی کا شاخسانہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی ناکامیوں، حسرتوں، خواہشوں کے مسماریت اور حادثات زمانہ سے لبریز ہیں۔ وہ حالات زمانہ پر کبھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ خوش آیند مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔

ہند کی عوام کا مذہب سے خاص تعلق پایا جاتا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والے موجود ہیں۔ یکجہتی اس ملک کا مقصد اولیں ہے۔ ہندوستان میں مذہبی تناظر میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ قرآن کریم، تاریخ اسلام، تصوف، رامائن، بھگوت گیتا اور اسی طرح کے بہت سارے تاریخی قصوں سے اُردو شاعری مزین نظر آتی ہے۔ مذہبی شاعری کا بنیادی مقصد انسان کو راہِ راست کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ ہر شاعر نے اپنے تئیں اس بات کی کوشش کی ہے کہ انسان بجائے گمراہی کی راہ اختیار

کرے اس سے قبل ہی اسے راہِ راست کی تلقین کی جائے۔ سرور نے نہ صرف ہندو مت کی تمام تعلیمات کا مشاہدہ کیا تھا بلکہ باشعور فرد ہونے کے باعث اس کے تجزیہ کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب اور مذہبی کرداروں سے اصلاح کا کام لینا شروع کر دیا۔ ان کی بہت ساری نظمیں لوک کہانیوں کا تجزیہ ہے۔ جن میں ہنودی کرداروں کے تحت اصلاحِ معاشرہ کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔

نظم ''لکشمی جی'' سرور کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ مذہبی افکار کا شاہکار نمونہ بھی ہے۔ اس نظم میں ہندی کے ایسے کئی الفاظ مل جاتے ہیں جو اُردو کے فصیح الفاظ کے بدل ہیں۔ سرور نے ان الفاظ کو اس چابکدستی سے بدلا ہے کہ پڑھنے والا بغیر کسی دقّت کے اسے بخوبی سمجھ لیتا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے لکشمی کو ایک ایسی دیوی کے کردار میں پیش کیا ہے جو کہ انسانوں کے گھر جا کر انھیں دولت و فراوانی سے نوازتی ہے۔

سُبھ مہورت وہ عجب تھی، وہ عجب سُبھ تھی لگن
کہ جب آکاش سے اترا تھا تریار سنگھاسن
نظر آئی تری صورت حُسن کی جوت
تو نے دیوی ہمیں اپنی جو دکھائے درشن

ان اشعار میں 'آکاش، سنگھاسن، جوت، درشن' جیسے ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن سرور نے انھیں جس انداز سے برتا ہے اس سے ان کی غیر مانوسی شکل ختم ہو جاتی ہے۔ اس دیوی کی عظمت و جلال کو بیان کرنے کی خاطر وہ اس کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کے تیور کی عکاسی کرنا نہیں بھولتے۔

ترچھی باکی وہ کمانیں تھیں کڑی دونوں بھویں
لیے بھرتے تھے کبھی بن میں جنھیں رام لکھن
رُخِ تاباں پہ برستا تھا ترے نور ازل
بن کے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی پھرن

رام لکھن (لکشمن) کا جنگلوں میں حق پر ہونے کے باوجود بھٹکنا اور اذیتیں برداشت کرنا انسان کے لیے بطور صبر کی تلقین کے دکھایا گیا ہے۔

نظم ''گنگا جی'' بھی سرور کے اسی مزاج کی مرقع خوانی ہے۔ یہ نظم بے حد شاندار ہے۔ اس میں المنا کی ، یاسیت، اور اشاروں کنایوں کا جدید استعمال ملتا ہے۔اس نظم میں بیک وقت خارجیت اور داخلیت کے عناصر یکساں طور پر اپنا تاثر چھوڑتے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔موضوع کے لحاظ سے اسے کافی اہمیت حاصل ہے۔گنگا ایک ایسی ندی ہے جسے ہندومت کے ماننے والے بھگوان شیو کے جٹاؤں (بالوں) سے نکلنے والی ندی مانتے ہیں۔ساتھ ہی وہ خود بھی ایک حسین وجمیل دیوی ہے جس کے پاس ایک حساس دل موجود ہے۔یہ ندی ہمالہ کے عظیم پہاڑوں سے اپنا سفر شروع کرتی ہوئی کئی ریاستوں کو سیراب کرتی سمندر میں جا ملتی ہے۔

اس نظم میں سرور نے کئی زمانوں کو ایک ایک مصرعے میں سمیٹ لیا ہے۔ہندستان کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے آپسی تعلق اور اخلاق کی تدریس کرتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے اس دیوی کی تعریف کی ہے جو بغیر کسی امتیاز کے ہر ایک کو سیراب کرتی ہے۔اس کے لیے نہ تو کسی کی کوئی بادشاہت ہے نہ ہی کوئی مذہب۔ یہ ایک تہذیب کا گہوارہ ہے جو سماج کو یہی تلقین کرتی ہے کہ ایک رہو۔سرور نے اپنی

جدت پسندی سے اس نظم میں گنگا کو ملک کی یکجہتی سے جوڑا ہے۔لیکن وہ اس ہندو دیوی کی عظمت کو بتلانا نہیں بھولے۔

او پاک نازنین! او پھولوں کے گہنے والی
سرسبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی
او ناز آفریں! او صدق و فضا کی دیوی
او صفتِ مجسم او پربت کی رہنے والی
صلی علیٰ! یہ تیری موجوں کا گنگنانا
وحدت کا یہ ترانا! او چپ نہ رہنے والی
حسن غیور تیرا ہے بے نیاز ہستی
تو بحر معرفت ہے او پاک باز ہستی

اس نظم کے آخری مصرعوں میں سرور گنگا ہی سے سوال کرتے ہیں کہ تیری طلب اور خواہش کیا ہے؟ آخر کیوں تو اتنا لمبا سفر طئے کرتے ہوئے ملک کو سیراب کرتی ہے۔اور تیرے وہ کیا مقاصد ہیں جن کے لیے تو روز آنہ اتنا لمبا راستہ طئے کرتی ہے۔

کیوں جادۂ طلب میں پھرتی کشاں کشاں ہے
تجھ کو تلاش ہے کس گم گشتہ کارواں کی
جاتی ہے تو جہاں کو ، آتی ہے تو کہاں سے
دل بستگی ہے تجھ کو کس بحر بے نشاں سے

مذہب انسان کو فلاح و بہبود کی طرف راغب کرتا ہے۔سرور نے اسی کا

سہارا لیکر اصلاح معاشرہ پر توجہ کی ہے۔انہوں نے ملک میں چل رہے مسائل کا حل مذہب میں تلاش کیا ہے۔مذہب سے بجائے تنفراور فساد کے وہ یکجہتی اور ایک ہونے کا سبق دیتے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح نظم ’’سیتا جی کی گریہ وزاری (رام چندر جی کی بن باس کے وقت) نظم ہیں جس میں ایک عورت کے جذبات کی عکاسی اور اُس کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔عورت پھر چاہے وہ کسی زمانے کی ہو اپنے مجازی خدا کی محبت میں اُس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کی طاقت رکھتی ہے۔اُسے خاوند سے جدائی قطعی برداشت نہیں ہوتی۔سرور نے عورت کے اس پاکیزہ رشتے کی تاریخی تناظر میں تصویر کھینچی ہے۔ ایسے دور میں جب کہ خواتین کو اتنے اختیارات نہ تھے تب اس طرح کا موضوع چننا اور اسے تاریخی پہلو سے بیان کرنا ایک نیا اور انوکھا انداز نظر آتا ہے۔

نظم کے مرکزی کردار میں سیتا جی اور رام جی ہے۔سیتا جی کو جب اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ رام جی اب بن (جنگل) میں جا کر زندگی گزارنے والے ہیں اور کیا پتہ کہ وہ اکیلے ہی جائیں۔سیتا دیوی کو ساتھ نہ لے جائیں۔اسی خدشے سے سیتا جی کے دل میں جو خیالات آتے ہیں اُسے ہی سرور نے اپنی مرکزی محور بنایا ہے۔اس میں ایک اور بات غور طلب ہے۔سرور نے عورتوں کے لیے بنے ہندومت کے اُن قوانین کی نشاندہی کی ہے جس میں ایک عورت کا ’’کنیا دان‘‘ (صدقہ کر دینا، ہمیشہ کے لیے کسی کو دے دینا) جیسی روایت اور عورت کا اس کے لیے پابند ہونا دکھایا ہے۔بظاہر یہ ایک بے حد حساس موضوع ہے۔لیکن سرور کے یہاں یہ ایک ایسی ریت ہے جس کے تحت عورت اپنے خاوند سے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔سرور کے پاس یہ روایت

بڑے ہی مثبت انداز میں ملتی ہے۔

نظم میں ایک ہندوستانی خاتون کا کردار انتہائی رومانی انداز میں دکھائی دیتا ہے۔جسے اپنے خاوند سے بے انتہا محبت ہے۔شوہر سے جدائی اُس کے لیے سوہانِ روح ہے۔وہ اپنے خاوند کے لیے ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہے لیکن اس سے جدائی اُسے قطعی برداشت نہیں۔سیتا جی اپنے خاوند رام جی سے اپنی خواہش کو یوں بیان کرتی ہے۔

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ناتھ لے چلو
ریکھا تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشہ دل ٹوٹ جائے گا
چھوٹا تمہارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا
راتیں نہ کٹ سکیں گی اکیلے فراق میں
کڑیاں وہ جس نے جھیلی ہوں جھیلے فراق میں
قسمت نے جب سے باپ کے گھر سے کیا جدا
سوامی! مجھے نہ تم نے نظر سے کیا جدا

رام جی جانتے تھے کہ سیتا جی ایک شہزادی ہے اور انھیں کبھی ایسے حالات کا سامنا نہیں ہوا ہے۔وہ شوہر سے جدائی میں سب کچھ کہہ رہی ہیں جبکہ جنگل میں رہنا ان کے لیے بہت تکلیف دہ عمل ہوگا وہ سیتا جی کے غم کو سمجھانا چاہتے ہیں۔

پتلی کی طرح آنکھوں میں شام و سحر رہی
پہلو میں بن کے صبر و شکیبِ جگر رہی

دُکھ آج تک سہا نہ غمِ روزگار کا
مجھ پر کرم رہا ستمِ روز گار کا

شوہراور بیوی کی یہ گفتگوانسان فطرت کے بہت قریب ہے۔سرور نے ان کرداروں کے تحت جنھیں ملک میں سب سے اونچا مقام حاصل ہے سماج کوعورتوں سے محبت اوران کے احترام کی تلقین کی ہے۔سیتا جی کواپنی جان دے دینا آسان لگتا ہےلیکن شوہر سے جدائی انھیں قطعی برداشت نہیں۔

صدمے تمہارے ہجر کے کیوں کر اٹھاؤں گی
میں مرمٹوں گی دکھ جو یہ دم بھر اُٹھاؤں گی
ہم راہ بن کو ناتھ مری روح جائے گی
سائے کی طرح ساتھ میری روح جائے گی
مجھ سے شب فراق میں تڑھا نہ جائے گا
روز سیاہ ہجر کا دیکھا نہ جائے گا
گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو
پاؤ گے بن سے آکے نہ جیتا غریب کو

نظم ''پدمنی''، اورنظم ''پدمنی کی چتا''،سرور کی ایک ایسی تاریخی نظمیں ہیں جن میں انھوں نے عورت کے ایسے کردار کوپیش کیا ہےجس کے پاس حسن کے ساتھ ساتھ ہمت اورقوت برداشت بھی بدرجہ اتّم موجود ہے۔سرور نے ایک قدیم واقعے کی طرف اشارہ کیا ہےجس میں ایک عورت کواس کے شوہر کی وفات کے بعد محل کے بیچ میں ستی (شوہر کی وفات کے بعد اسی کے ساتھ بیوی کوجلا دینا) کیا جاتا ہے۔اس روایت پرطنز

کستے ہوئے سرور نے عورتوں کی عظمت اورمردوں کے بنائے گئے بے جاقوانین پر نکتہ چینی کی ہے۔ان کے مطابق 'پدمنی' ایک عظیم خاتون تھی جوکہ مردوں کے بنائے گئے ریتی رواجوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔سروراس کردار بے حد صابر وقانع دکھلاتے ہیں۔اس پر ہونے والی زیادتیوں میں سب سے پہلے ماں باپ کا گھر چھوڑ کرخاوند کے گھر آنا۔پھرسب کا دل جیتنےخصوصاً شوہر کا۔پھراسکے خاوند کا جوانی میں ہی وفات پاجانا جواس کا مجازی خدا تھا۔جس کے باعث اس کا جوانی میں بیوہ ہوجانا۔اس کے بعد بھی سماج کے چند جنسیت زدہ لوگوں کا اسے ہوس سے دیکھنا اوراس کا بھری جوانی میں اپنے آپ کوسپرد آتش کر دینا۔سرور کے پاس یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جواس کردار کوبے حد مظلوم بنا دیتی ہیں۔

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم
اور پروانوں کو دی سوزِ وفا کی تعلیم
جب ہر ایک چیز کوقدرت نے عطا کی تعلیم
آئی حصّے میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم
نرم و نازک تجھے اعضاء دیے جلنے کو
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کو

قدرت نے سبھی کوکسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیا۔جیسے عندلیب (بلبل) کوجس کا کام ہی کسی کی یاد میں آہ وفغاں کرنا ہےاور پروانوں کا شمع کی خاطر خودکوسپرد آتش کر دینا ہے اُسی طرح اس حسن کی دیوی کو جسے قدرت نے صورت اورسیرت دونوں بخشی تھی فنا ہونے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔سرور کہتے ہیں کہ تو وہ شمع ہے جس کو

پروانے کی طرح جل مرنے کے لیے وجود بخشا گیا۔ اور تو وہ لیلیٰ تھی جسے مجنوں کی طرح صحرا پیمائی کرنی پڑی۔ تجھے ایسا حسن دیا کہ تو کسی بادشاہ کے گھر کی ہی رونق بن سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ تجھے ایک مرد کی طرح باہمت بنایا۔ تو بیک وقت نازنین بھی ہے اور جاں فروش بھی کہ تیرے لیے وفاداری ہی سب کچھ ہے۔

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو
تو وہ لیلی تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونقِ خلوتِ شاہانہ بنایا تجھ کو
نازش ہمتِ مردانہ بنایا تجھ کو

سرور سماج اور اُس روایت کو ذمہ دار مانتے ہیں کہ ایک ایسی خاتون جس پر دیوی کا گمان ہوتا جو کہ حسن و اخلاق کا پیکر ہواُسے شوہر کے انتقال کے بعد یوں سپرد آتش ہونا پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ قدرت نے ایک نور کا پتلا بنا کر اس میں دنیا جہاں کی پاکیزگی سمودی تھی۔ جسے آگ لگادی گئی۔

نور کا پتلا بنایا تا قدرت نے ایک
پھونک ڈالا تو نے اس کو آسمانِ برق

پدمنی کی جن حالات میں موت ہوئی وہ سرور کے لیے باعث ننگ وشرم ہے۔ اس کا ذمہ دار وہ پورے سماج کو مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمام ہی اس کے لیے ذمہ دار ہیں اور اس کا خون ہمارے سروں پر ہے۔ اس کے خون کے چھینٹے اب زمانہ والے چاہے کتنا بھی چھڑانا چاہیں وہ دامن سے چھوٹے گے نہیں اور بروز قیامت اس کا حساب دینا ہی پڑیگا۔

دھو رہا ہے آہ! دھبے خون کے کیا بوالہوس
یہ نہ چھوٹیں گے ترے دامن سے تا روزِ شمار

اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارے کا مقصد زمانے کو اُس صبر اور قناعت کی طرف راغب کرنا نظر آتا ہے جس طرح ایک عورت اپنی عزت اور پاکدامنی کی بقاء کی خاطر فنا ہوگئی سرور سماج کو اس جانب راغب کرتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب میں دو ندیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے جن میں ایک تو گنگا ہے اور دوسری جمنا۔ ان دونوں ندیوں کو دیویوں کا درجہ حاصل ہے۔ ہندومت کے ماننے والے ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ گنگا میں ایک دفعہ ڈُبکی (نہانہ) سے انسان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جمنا ہندوستان کو ہرا بھرا رکھتی اور اس کے حسن وضروریات کا خیال رکھتی ہے۔ مذہبی نکتہ نگاہ سے جمنا کو گنگا کی چھوٹی بہن اور اسی کی طرح حسین دیوی کا مقام حاصل ہے۔ وہ جمنا کا ہی کنارہ تھا جہاں ہندومت کے ایک بڑے دیوتا کرشن اور رادھا کی پیار کی داستان بیان کی گئی ہے۔ متھرا کے گھاٹ پر جہاں سے جمنا ندی بہتی تھی کرشن اپنی لیلائیں دکھایا کرتے تھے۔ جمنا کی ایک اور امتیازی خوبی اس کا دیوی کی شکل میں باوقار ہونا ہے۔ اس میں اپنی بڑی بہن (گنگا) کی طرح تلاطم نہیں ہے بلکہ وہ بڑی سبک روی سے اپنی بہن سے ملنے اُس سے ایک ہونے اس میں گُم ہوجانے کے لیے بہتی چلی جاتی ہے۔

نظم ''جمنا'' میں سرور نے جمنا کو ایک انسانی شکل میں دی ہے۔ جس کا حسن اور اس کی پاکیزگی دیکھنے کے لائق ہے۔ وہ ایک طرف اس باوقار دیوی کے حسن اس کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں۔

دھیمی دھیمی بہنے والی ایک نہرِ دل نشیں
آبجو چھوٹی اک نازک خرام و نازنین
تشنگیٔ شوق گنگا میں بجھانے کے لیے
جا رہی ہے اپنی ہستی کو مٹانے کے لیے

کرشن اور رادھا کی داستاں کو جمنا کے تٹ پر دکھاتے ہیں۔

یہ وہ جمنا ہے کہ رادھا سی حسیں نے مدتوں
برج کی اک پاک دامن نازنین نے مدتوں
بنسی والے کی جدائی میں اُڑا کر سر پہ خاک
اپنے اشکوں سے کیا ہے دامنِ ساحل کو پاک

سرور نے جمنا کو عشق اور حسن کی دیوی کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس کی صحبت میں حسن و عشق پنپتا ہے۔ وہ ایک طرف کرشن اور رادھا کے پیار کے گیت سناتے ہیں تو وہی دوسری جانب ممتاز اور شاہجہاں کی محبت کی داستاں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

آہ! اے ممتاز! تیرے عشوہ ہائے دل فریب
وہ تبسم ہائے شیریں وہ ادائے دل فریب
وہ لبِ نازک پہ موجِ خندہ ہائے شکّرین
آہ! وہ جمنا کا منظر وہ نگاہِ شرمگیں

نظم ''مہاراجہ دسرتھ کی بے قراری'' رام جی کے جنگل جانے اور اُس پر ایک باپ (مہاراجہ دسرتھ) کی کیفیت کو بڑے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ رام جی

لکشمن اور سیتا کو لیے جب بن باس کے لیے چل پڑتے ہیں تب مہاراجہ دسرتھ کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔

پھرتی ہے آہ! دیدہ و دل میں ادائے رام
آیا چمن میں لے کے نہ بوئے قبائے رام
بن سے اجودھیا پھرا خالی ہاتھ تو
لایا ہ لکشمن کو ، نہ سیتا کو ساتھ تو
چھوڑ آیا میرے پھولوں کو کس بن میں آہ! تو
لے چل مجھے بھی دشت کے دامن میں آہ! تو
تیر و کماں کو دوش پہ ڈالے ہوئے جہاں
پھرتے ہیں میرے نازوں کے پالے ہوئے وہاں

بادشاہِ وقت ہونے پر انھیں رام جی کو بن باس کے لیے بھیجنا پڑا لیکن وہ باپ بھی تھے بچوں کی یاد میں تڑپ کر کہتے ہیں۔

بچوں کو اپنے ایک نظر اور دیکھ لوں
صحرا میں ان کو خاک بسر اور دیکھ لوں

آتا ہے مجھ کو رام پہ بے اختیار پیار
کرلوں لگا کے سینے سے پھر ایک بار پیار
آنکھوں کا میری نور تھے ٹھنڈک جگر کے تھے
دل کا مرے سرور تھے بصارت نظر کی تھے

یہ ساری سازش رانی کیکئی کی رچی ہوئی تھی۔ انھیں پتہ تھا کہ رام جی کے ہوتے ہوئے ان کی اولاد مہاراجہ نہیں بن پائیگی اسی لیے یہ سازش رچی گئی تھی۔ راجہ دسرتھ یہ سب کچھ جان گئے تھے اسی لیے وہ اس جدائی اور غم کا ذمہ دار کیکئی کو ہی مانتے ہیں۔

بدلے کہاں کے کہاں کے مجھ سے لیے تو نے کیکئی
داغوں پہ آہ! داغ دیے تو نے کیکئی
رام ول لچھمن کی آہ! کہاں ماتا تجھے
میرے غمِ دروں کی خبر آہ! کیا تجھے

بالک تھے رام دشتِ خودری کے دن نہ تھے
بچے ابھی تھے باد یہ گردی کے دن نہ تھے

سرور جہان آبادی کی تمام تر مذہبی نظمیں ان کے مذہبی لگاؤ پر تو نظر آتی ہیں۔ ان نظموں میں ہنودی کرداروں کے ذریعے اصلاح معاشرہ کی کوششوں مقصد اصلی محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے قلبی کیفیات بھی بخوبی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی سرور کی یہ نظمیں جدیدیت کے ابتدائی نقوش کے طور پر ادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔

☆

آبگینہ وقت فیض احمد فیضؔ

ترقی پسند تحریک کے اہم شعراء میں فیض احمد فیضؔ کا نام سب سے اوپر آتا ہے۔ فیض کی شاعری اس تحریک کے لئے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئی۔ اس تحریک میں فیض کے کلام اور ان کے نئے تجربوں نے ایک جان سی ڈال دی تھی۔ فیض کی پیدائش ''سیالکوٹ'' کے ایک گاؤں ''کالا قادر'' میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ فیض احمد کے والد کا نام ''سلطان محمد خان'' تھا۔ فیض کے کل چار بھائی اور پانچ بہنیں تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر اور مسجد میں ''مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی درسی'' کے پاس ہوئی۔ اس کے بعد فیض کو سیالکوٹ کے ''اسکاچ اسکول'' میں داخل کیا گیا اور ۱۹۲۷ء کو وہ اسی اسکول سے میٹرک میں اول درجہ سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں بی۔اے آنرز کیا اور ۱۹۳۳ء میں انگریزی سے ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۴ء میں 'اورینٹل کالج لاہور' سے عربی میں ایم۔اے کیا۔ فیض کی قابلیت ہی تھی کہ ایم۔اے ہوتے ہی انھیں

ملازمت مل گئی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ ''ایم اے او کالج'' امرتسر میں شعبہ انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ یہ ملازمت ۱۹۴۰ء تک قائم رہی، اسی سال یہاں سے استعفیٰ دے کر ''ہیلی کالج لاہور'' میں انگیریزی پڑھانے چلے گئے۔ فیض کی بے چین طبیعت نے انہیں یہاں بھی ٹھہرنے نہ دیا اور ۱۹۴۲ء میں فوج میں داخل ہو گئے۔ فوج میں ان کی قابل ستائش کارکردگی کے سبب انہیں M.B.E خطاب عطا کیا گیا۔ فیض نے فوج میں رہتے ہوئے شادی کی۔ ۲۸/ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو فیض نے کشمیر میں ''ایلسن کیتھرج جارج'' سے شادی کی۔ فیض کی والدہ نے بعد کو ان خاتون کا نام ''کلثوم'' رکھا۔ فیض اپنی حساس طبیعت اور ملک ہند سے محبت کبھی چُھپا نہ سکے۔ جبکہ وہ سرکاری نوکر اور ایک لیفٹننٹ کرنل تھے۔ اسی سبب ۹/ مارچ ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی سازش کیس میں جیل بھی گئے۔ ان کے جیل میں رہنے کی مدّت چار سال ایک ماہ اور گیارہ دن ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۳۹ء تک رسالہ ادب لطیف کے ایڈیٹر رہے۔ بعد کو مدیر'' پاکستان ٹائمز'' انگریزی اخبار'' امروز'' اور'' لیل و نہار'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۲۰/ نومبر ۱۹۸۴ء کو فیض دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

فیض نے جماعت دہم سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑے اچھے شاعر تھے۔ کچھ ہی وقت بعد وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اس تحریک میں سب سے اونچا نام اگر کسی شاعر کا تھا تو وہ فیض احمد فیضؔ تھے۔ فیض کا پہلا مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' ۱۹۴۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ'' دست صبا، زندان نامہ، دست تہِ سنگ، سر وادیِ سینا، شامِ شہر یاراں'' جیسے شعری مجموعوں کے علاوہ'' میزان (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)''، ''مرے دل مرے مسافر''، ''صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط)''، ''متاع لوح و قلم ۱۹۷۳ء (تقاریر اور متفرق تحریریں)''، ''سفر نامہ کیوبا ۱۹۷۴ء'' ''ہماری ثقافت ۱۹۷۶ء''، ''مہ و سال آشنائی ۱۹۸۰ء (یادیں اور تاثرات)'' اور'' قرض دوستاں (مقدمے، دیباچے اور فلیپ)'' جیسی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ فیض نے منتخب کلام کے تراجم کے تحت 'انگریزی، فرانسیسی، روسی، فارسی، عربی، چیکوسلوا کیا، ہنگری، جاپانی، منگولیئن، بنگالی، ہندی، نیپالی کے علاوہ بعض اور زبانوں سے ترجمے کیے ہیں۔

بیسویں صدی ہندوستان کی آزادی اور جدوجہد کی صدی رہی ہے۔ انگریزوں کی غلامی سے آزادی اور عوام کو اس غلامی کے خلاف تیار کرنا بڑا ہی مشکل عمل تھا۔ ملک کی عوام کو آزادی ہند کی جدوجہد اور اپنے حقوق حاصل کرنے کی تیاری میں ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں ''ترقی پسند تحریک'' اور اس سے منسلک شعراء کا کام قابل ستائش ہے۔ فیض بھی ان لوگوں میں صفِ اوّل پر نظر آتے ہیں جنہوں نے عوام کو بیدار کرنے ک کی ہر ممکن کوشش کیں۔ فیض نے اس تحریک کے مقصد کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ فیض احمد فیضؔ کی شاعری کا مقصد ملک کی عوام کو بیدار کرنا اور جدوجہد کے لئے تیار کرنا تھا۔ ان کی شاعری کا محور انسانیت کی بقاء ہے۔ وہ اپنے کلام میں ملک کے لئے قربان ہوتے نظر آتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں انہیں نہ تو کسی محبوبہ سے اس طرح کا عشق ہوتا ہے کہ اُس کے خاطر صحرا نشین یا دنیا سے بیگانہ ہوا جائے اور نہ ہی وہ کسی کے زلفوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ فطرت کے اُن احساسات کو چھوتے ہیں جس میں فرد کی انا اور عزت کو دخل ہے۔ وہ مبالغہ بھری دنیا میں جینے والے انسان نہیں۔ وہ ملک کی عوام کو لذت اور نشاطیہ زندگی سے نکال کر

جدوجہد کے لیے تیار ہونے پر راغب کرتے ہیں۔

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہے وصل کی راحت کے سوا

فیض کسی ایسی دنیا کے متلاشی نہیں جو ماوٗرائی ہو۔وہ حقیقت پسند شاعر تھے۔محبوب اور عشق کے لئے اُن کے پاس پیمانہ دوسروں سے جدا تھا۔

رازِ اُلفت چُھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

فیضؔ کی شاعری میں نعرہ بازی اور خطیبانہ اظہار کی جگہ ایک نرم اور شیریں لہجہ ملتا ہے۔یہی وجہ رہی کہ انھیں اپنے ہم عصروں میں امتیاز حاصل ہوا۔ان کے پاس سیاسی اور سماجی شعور پختہ ہے۔وہ شاعری کی فنّی لوازمات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔فیض جذباتیت کو اپنے فکر پر کبھی غالب نہیں آنے دیتے۔ان کی طبیعت پر سماجی غیر مساوی سلوک اور طبقاتی کشمکش کا گہرا اثر ہے۔اس کے علاوہ فیض کے یہاں جمالیات اور روحانیت کو بھی ایک الگ مقام حاصل ہے جو کہ اُن کے معاصرین میں کم ہی نظر آتا ہے۔فیض اپنے کلام اور نظریات کے تحت کسی ایک طبقہ یا قوم کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ تمام انسانیت پر محیط ہے۔

تحریکِ آزادی،غربت ، افلاس ، غلامی ومحکومی ، یہ وہ مضامین ہیں جس پر فیض کی شاعری کی بنیادیں قائم ہوتیں ہے۔فیض کا شعری رویہ اُردو شاعری میں غزل

سے ہم آہنگ ہے۔انہوں نے غزل کی شعریات ،لفظیات ،استعاروں ،علامتوں اور جدید نظریات سے اپنا ایک الگ انداز پیدا کیا ہے جو کہ اُن کی شاعری کو ایک الگ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں قدیم کلاسیکی انداز کو باقی رکھتے ہوئے لفظیات اور علائم کو اپنے عصری پس منظر میں نئ معنویت کے ساتھ خلق کیا۔اُن کی غزلوں میں رومانیت اور جمال پرستی کا عنصر غالب نظر تو آتا ہے لیکن ایک نئے پیرائے میں۔وہ نہ تو عشق میں گرفتار مجنوں ہیں نہ ہی صحرا گرد۔وہ حقیقی دنیا کے شاعر ہے ان کے پاس ہر چیز کا پیمانہ حقیقت کے قریب تیار ہوتا ہے۔فیض اپنی رومانیت کو اپنے مقصد اور قوم کی اصلاح کے لئے استعمال کرتے نظر آئے۔وہ ترقی پسند تحریک کے اتنے گرویدہ ہیں کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی تحریک سے متاثر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا محبوب نہ تو آسمانوں میں رہتا ہے اور نہ کوہِ قاف کی سیر کراتا ہے۔فیض کی رومانیت میں اُن کا محبوب ایک ایسا کردار ہے جس سے وہ اپنے تمام مسائل و آلام کا اظہار کر سکتے ہیں وہ کبھی اپنے محبوب سے اپنے المناک حالات کو نہیں چھپاتے بلکہ اُس سے اپنی کسم پرسی اور زمانے کے حالات کا ذکر کرتے ہیں ، اُسے اس بات کا احساس کرواتے ہیں کہ اب پہلے کی سی زندگی نہیں رہی یہ وقت جدوجہد اور ملک وقوم کے لئے کچھ کر جانے کا ہے۔فیض کی شاعری میں حب الوطنی اور قوم پرستی کی ترجمانی ہے اور وہ اپنے محبوب کو بھی اسی جانب راغب کرتے ہیں۔اپنی نظم ’’چند روز اور مری جان!‘‘ میں کہتے ہیں۔

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہے ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں

محبوب سے دل لگی اور اُس سے راز و نیاز کی باتیں اُردو شاعری کی روایت رہی ہے۔لیکن اس روایت کو فیض نے اس انداز سے برتا کہ شاعری میں نیا پن صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔وہ کلاسیکی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے محبوب سے راز و نیاز کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن اُس میں ماورائی انداز کہیں نہیں ملتا بلکہ دور حاضرہ اور ملک کے سنگین حالات کو محبوب کے سامنے رکھا جاتا ہے۔اس پر محبوب کا شکوہ کرنا، اعتراض جتانا اور سیرابی عشق سے دوری پر فیض کے پاس جواب تیار ہوتا ہیکہ۔''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''۔فیض اپنی نظموں اور غزلوں دونوں ہی میں کلاسیکیت کے پرستار تھے لیکن جدید زاویے انداز سے۔اُن کی نظموں اور غزلوں کے موضوعات عام روش سے ہٹ کر ہیں۔

فیض احمد فیض کی نظم نگاری کا مقصد ادب میں اُن احساسات کو پیدا کرنا تھا جو ملک اور عوام کے جذباتوں کو اُجاگر کرے۔وہ قوم کی محنتوں اور ان کی کاوشات کو سراہا کر اُنھیں مزید جدوجہد کی جانب راغب کرتے ہیں۔فیض اپنی نظم نگاری میں قوم پرستی، حب الوطنی، غربت، یاس، تنگدستی، اور افلاس کا ذکر کرتے ہیں۔ان کی نظم نگاری میں شدت پسندی نہیں ملتی۔ بلکہ اپنے مقصد کو رومانیت کی چادر میں لپیٹ کر محبوب سے راز و نیاز کی باتوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔فیض کی نظموں میں رومانیت اور

جمالیات کا استعمال ملک کو عصری مسائل سے روشناس کرانے اور سامراجی طاقتوں کے ظلم کو بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

فیض کی نظم نگاری سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات پر ایک حساس فکر اور گہری نظر رکھنے والے دانشور کا ردعمل ہے ان کی نظموں میں سماجی مسائل کی بہترین عکاسی ہے۔جس طرح انہوں نے آزادی ہند کے لئے نظمیں کہیں ہے، اُسی طرح ہندوستان کی تقسیم اور فسادات کے لئے بھی بہت کچھ کہا۔وہ ایک انسان دوست شاعر تھے۔انہیں کسی ایسی سوچ سے کوئی تعلق نہیں جو تمام انسانوں کو آپس میں لڑاتی ہے۔ملک کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کا آزادی کے بعد یوں آپس میں ایک دوسرے سے مذہب اور سیاست کی بنیاد پر لڑ مرنا بہت المناک واقعہ ہے۔تقسیم ہند ایسا سانحہ تھا جو ہر شاعر کی زندگی میں ایک الگ مقام رکھتا ہے۔فیض بھی اس دور سے گزرے۔لیکن ان کے پاس اُس طرح کی شدت پسندی نہیں ملتی جو تقسیم ہند اور فسادات کی وجہ سے دیگر شعراء کے پاس ہے۔انہوں نے نفاست و پاکیزہ پیراؤں میں اپنی شاعری کو باقی رکھا۔

ان کی نظموں میں ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، رقیب سے، تنہائی، موضوع سخن، ہم لوگ، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، چند روز اور مری جان، میرے ہمدم میرے دوست، صبح آزادی، لوح و قلم، نصیب آزمانے کے دن آرہے ہیں، طوق و دار کا موسم، واسوخت، بنیاد کچھ تو ہو، اگست ۵۵ء، جشن کا دن، شام، تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں!'' جیسی قابل ستائش نظمیں ہیں۔ان نظموں میں فیض نے زمانے کی حقیقت، ماحول کی یاسیت، اور محبوب سے رومانی باتیں سبھی کچھ

کیا۔اپنی نظموں میں وہ کبھی موضوع سے ہٹ کر کچھ نہیں کہتے۔وہ ایک ترقی پسند شاعر تھے اور ان کی تمام شاعری میں اس کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ ہند کی آزادی اور انسانیت سے محبت کی راہ پر اپنے محبوب کو بھی ڈالتے ہیں۔فیض کی نظم گوئی کے سلسلے میں ڈاکٹر صدیق محی الدین لکھتے ہیں :

”ترقی پسند تحریک کے ہمہ گیر اثرات سے وہ بھی متاثر ہوئے۔اس تحریک کے اثرات کے نتیجے میں انھوں نے بھی تحریک آزادی ،غربت،افلاس ،غلامی و محکومی کے خلاف مؤثر نظمیں کہی ہیں ۔ان کی نظموں سے اُن کی قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔اُن کی اس قبیل کی نظموں میں ”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“،”چند روز اور مری جان“،”موضوع سخن“، ”ہم لوگ“،”میرے ہمدم میرے دوست“،”صبح آزادی “اور

”لوحِ قلم “ بطورِ خاص اہم ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دور میں تقریباً سبھی شعرا آزادی اور اخوت کے موضوعات کو برت رہے تھے۔انہوں نے محبوب کا انتظار بھی گویا انقلاب کی طرح کیا۔مجاز لکھنوی نے محبوبہ کے آنچل کو پرچم بنانے کی بات کہی ،فیض بھی نظم”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“ میں عصری زندگی کے مسائل،غلامی ،افلاس، اور سامراجی طاقتوں کے ظلم کا بیان کرتے ہیں۔ “

(ڈاکٹر صدیق محی الدین،قومی یک جہتی اور اُردو نظم۔صفحہ نمبر۔۶۹)

فیض کی نظموں میں ”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“ کافی اہمیت کی حامل ہے۔یہ نظم ان کی آزادی ہند کی تڑپ کو پیش کرتی ہے۔ایک معشوق کا اپنے عاشق سے محبت کے بدل اس طرح کا جواب کافی عجیب اور معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

یہ نظم فیض کی شاہکار نظم ہے۔اس نظم میں فیض نے اپنے معشوق سے زمانے کی حقیقت اور حالات کی یاسیت کا ذکر بڑے دلکش پیرائے میں کیا ہے۔وہ اپنے معشوق سے چاند تاروں کی باتیں نہیں کررہے،وہ محبوب کی حسین زلفوں کے اسیر نہیں ہوتے،وہ اُس کے مجسمہ حسن سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ محبوب کو ہی سمجھاتے ہیں کہ بیشک تیرا حسن بڑا دلکش ہے لیکن میرے محبوب اور بھی دُکھ ہے زمانے میں ایک تیرے وصال کا غم نہیں ہے۔ملک کے حالات اورعوام کی کسمپرسی کا ذکر وہ اپنے معشوق سے کرتے ہوئے ہچکچاتے نہیں۔جبکہ اُن کا معشوق ایک روایتی معشوق ہے جسے صرف اس بات کی خواہش ہے کہ اُس کا عاشق اُس سے بے انتہا محبت کا اظہار کرے۔فیض کلاسیکی شاعری کے روایتی طریقے کو اس انداز میں برتتے نظر آئے جس کا گمان بھی ان سے قبل پہلے نہیں ملتا۔وہ اپنے معشوق سے ملاقات پر معشوق کے حسن سے متاثر

ہونے کے بجائے اُس سے اُن مسائل کا ذکر کرنا جو زمانے بھر میں سبھی کو لاحق ہے ضرروی عمل گردانتے ہیں۔ایک انوکھا مگر کامیاب تجربہ رہا۔وہ کسی ماوَرائی دنیا کو پیش کرنے اور محبوب کے عشق میں گرفتار ہوکر دنیا سے بیگانہ ہونے کے بجائے خود اپنے محبوب کو حقیقی دنیا میں کھینچ لاتے ہیں یہی اُن کی شاعری کی بڑی خوبی ہے۔فیض اپنی دوسری نظم ''چندروز اورمری جان'' میں بھی کچھ اسی طرح کا رویہ اپناتے ہیں۔وہ اپنے محبوب سے وصال کے نہ ہونے پر اُسے صبر کی تلقین کرتے ہے۔وہ نظم میں اپنے محبوب کو مسلمانانِ ہند کی تاریخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔انگیریزوں کی غلامی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے صبر کی تلقین کرتے ہیں۔فیض چاہتے ہیکہ اُن کا معشوق زمانے کے چلن کو جان لے اور خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقی جہاں کو دیکھے۔ان کی خواہش ہے کہ اُن کا معشوق آج کی حقیقت کو جانے اور اس حقیقی دنیا کے مسائل سے نجات کے لیے خود بھی سرپیکار ہوجائے۔

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی نہیں رہنا
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد

دل کی بے سُود تڑپ ،جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان ! فقط چند ہی روز

فیض کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ کبھی ترقی پسند ادب کے حدود سے باہر قدم نہیں نکالتی ۔خود انہوں نے لکھا تھا کہ ’’ترقی پسند ادب صرف ترقی پسند نہیں ادب بھی ہے‘‘ ۔اس لئے ان کی شاعری میں نہ تو غیر مانوس ترکیبیں ملتی ہیں اور نہ ہی علامتیں ۔فیض کی نظموں کی حسن کاری اس کی شیرینی اور نغمگی ہمیں سلاتی نہیں جھنجوڑتی نہیں بلکہ بڑی سادگی کے ساتھ ایک حوصلہ اور عزم عطا کرتی ہے جو کہ کم ہی شعراء کے کلام کی خوبی ہے ۔فیض شدت پسند شاعر نہیں تھے اُن کی نظموں میں نہ تو کہیں شدت پسندی ہے اور نہ دیوانہ وار جذباتی انداز ۔وہ ایک معتدل شاعر تھے جن کے پاس دنیا کے مصائب کا ذکر ہے ۔اور ان مسائل کو حل کرنے کی راہ بھی ۔وہ زمانے اور حالات سے ڈرتے نہیں ، نہ ہی اس کے شدت سے مخالف ہے ۔وہ جانتے ہے کہ دنیا میں رہنا ہے تو مصائب اور آلام سے جوجھنا ہی ہے ۔فیض اپنی نظموں کے ذریعہ ایک طاقت اور عزم دیتے نظر ہیں جو کہ ہر ایک کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتی ہے۔

فیض نظریاتی طور پر ترقی پسند ضرور تھے لیکن اپنے معاصر ترقی پسند شعراء سے اس بناء پر بہت مختلف تھے کہ انہوں نے تحریک کی شدّت پسندی سے بڑی حد تک انحراف کیا ۔ان کے نزدیک ترقی پسندی محض نعرہ بازی سے عبارت نہیں ،ان کے لہجے میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور دھیما پن ہے ۔وہ شدت پسند نہیں تھے ۔فیض الفاظ کی گھن گرج اور فلک شگاف نعروں سے قاری کو مرعوب نہیں کرتے بلکہ افکار و جذبات

کی رو میں بہنے کے بجائے نہایت ضبط سے کام لیتے ہیں ۔اُن کی اسی فراست نے انھیں غزل میں اُن کا ایک الگ مقام عطا کیا ۔فیض اپنی غزل گوئی سے کم اور نظموں سے زیادہ جانے گئے ۔لیکن ان کی غزلیں بھی ان کی نظموں کی طرح اپنے اندر رومانیت اور ترقی پسند نظریہ سمیٹے ہوئے ہیں ۔

نصیب آزمانے کے دن آرہے ہیں

قریب ان کے آنے کے دن آرہے ہیں

جو دل سے کہا ہے ، جو دل سے سُنا ہے

سب اُن کو سنانے کے دن آرہے ہیں

اُردو شاعری کی روایت یا کلاسیکیت سے فیض بہ خوبی واقف تھے انہوں نے اس کلاسیکیت کو ہمیشہ اپنی شاعری میں جگہ دی لیکن انداز خود کا ہی برتا ۔وہ اُردو کی کلاسیکیت کے پرستار ہوتے ہوئے بھی جدت پسند شاعر ہیں ۔وہ کلاسیکیت اور جدیدیت کو ایک ساتھ لے آئے ۔اس انداز نے اُن کی غزلوں میں چار چاند لگا دیئے ۔فیض کی غزل گوئی میں ایک پُر اسرار دلکشی پائی جاتی ہے ۔ان کی غزلوں کی اس سحر کارانہ حسن کا راز نہ صرف ان کے مخلص جذباتوں میں پوشیدہ ہے بلکہ تحریر کی انبساطیت میں بھی محسوس ہوتی ہے ۔ان کی غزلوں کی زمین شگفتہ ،بحریں مترنم اور لب ولہجہ نہایت شیریں ہے ۔فیض کے تخیل کی شادابی اور ان کی طبیعت کی شیرنی نے ان کی غزلوں کو بھی شاداب اور شیریں بنا دیا ۔زندگی کی تلخیاں ضرور موجود ہیں لیکن تلخ گفتاری بالکل نہیں ملتی ۔حقیقت یہ ہے کہ فیض نے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کو سمجھا ہے ۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فیض ہمیں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی محبت کرنا

سکھاتے ہیں۔فیض نے خود لکھا ہے ''میں چاہتا ہوں دنیا سے جتنا دُکھ کم ہو سکے اچھا ہے'' اور یہی ان کی شاعری کا پیغام بھی ہے۔ان کی غزلوں میں تخیل کی لطافت، بیان کی روانی، اورفکرانگیز اشاروں کے خاص جوہر نظر آتے ہیں۔

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے
جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

فیض نے ماضی کے ادبی ورثے اور کلاسیکی روایت کو رد کرنے کے بجائے اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا اور خود کی نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔بہار، شمائل، عنبری آنکھیں، آبشار سکوت، شب گزیدہ سحر وغیرہ فیض کی تخلیقی صلاحیت اور غزل گوئی کی آئینہ دار ہیں۔انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ کلاسیکی شاعری خصوصاً غزلوں میں علامت اور استعاروں کے پردے میں کہا ہے۔مثلاً محبوب سے ان کی عام مراد'' ملک وقوم '' ہے۔اور رقیب کا مطلب'' ملت وقوم کا دشمن'' ہے۔فیض جیل میں بھی رہے وہاں کے مصائب والم انہیں یاد تھے انہوں نے جیل میں رہ کر بھی اپنی کچھ غزلیں کہیں تھی جن میں آزادی کی خواہش، جدوجہد کا جذبہ اور تکلیفوں کا ذکر مل جاتا ہے۔

دل میں اب یوں تیرے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
اک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیران حرم آتے ہیں
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گذرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اقبال کے بعد فیض احمد فیض کی شاعری کے اثرات ہندو پاک کے مسلمانوں پر سب سے گہرے نظر آتے ہیں۔فیض قوم پرست انسان تھے۔انہیں مسلمانوں سے بے پناہ محبت تھی۔وہ اپنی شاعری میں کبھی محبوب کی تشبیہ کے ذریعہ تو کبھی عاشق بن کر قوم سے اپنی محبت کا احساس کرواتے رہے۔وہ قوم کے دشمنوں کو رقیب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری کا مقصد جدوجہد اور انسانی احساسات کو چھونا ہے۔وہ لوگوں کو راہ تو دکھاتے ہے لیکن خود راہ نما نہیں بنتے۔وہ عوام کو پستی سے بلندی کی جانب لے جانا چاہتے تھے۔فیض اپنی اس کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔وہ عوام کے جذباتوں تک پہنچ رکھتے تھے۔

☆

اخگرِروح اسرار الحق مجاز

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلب گار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خوابِ عشرت میں ہیں اَربابِ خرد
اوراک شاعرِ بیدار ہوں میں

اسرارالحق مجاز ترقی پسند شعراء میں ہر دل عزیز شاعر مانے گئے۔ان کے کلام نے کافی مقبولیت حاصل کی۔'ترقی پسند تحریک' کے اہم شعراء میں مجاز ایک بڑا نام ہے۔مجاز اُن چنندہ شعراء میں رہے جو'ترقی پسند تحریک' سے شروعاتی دور میں

وابستہ ہوگئے تھے۔اس تحریک میں کم عمری میں شامل ہونے والے شعراء میں مجاز کا نام سرفہرست ہے۔نوجوان شعراء میں ان کا مجموعہ سب سے پہلے منظرعام پر آیا۔مجاز کے کلام کو نہ صرف نوجوان مردوں نے پسند کیا بلکہ صنف نازک کی جانب سے بھی انہیں کافی سراہا گیا۔مجاز کی شاعری انقلاب اور تغزل کا حسین ترین امتزاج ہے۔ان کی ابتدائی نظموں پر''جوش''اورغزلوں پر''عزیزلکھنوی''اور''فانی'' کا اثر نمایاہے۔بعدکو مجاز نے اپنا انداز بدلا اورایک نئی جہت سے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔انہوں نے ایک ایسا لب ولہجہ وضع کیا جس میں نہ تو جوش کی شاعری کی کرختگی اور درشتی تھی نہ عزیز اور فانی کے لہجے کا اضمحلال اور واماندگی۔

مجاز''ردولی''میں ۱۹۱۱ءکو پیدا ہوئے۔والد کا نام''چودھری سراج الحق'' تھا جنھوں نے وکالت پاس کی تھی لیکن سرکاری ملازمت کو ترجیح دی۔مجاز کی تعلیم آگرہ اور علی گڑھ میں ہوئی۔والد کے آگرہ تبادلہ پر مجاز اوران کے تمام گھر والے آگرہ آگئے۔اتفاق یہ ہوا کہ آگرہ میں جہاں مجاز کا کرایہ کا مکان تھا اُسی سے متصل''فانی بدایونی'' کا مکان بھی تھا۔حتّٰی کہ اُپری منزل میں ایک دروازہ دونوں مکانوں کو جوڑتا تھا۔آگرہ میں اُس وقت فانی کا ہرطرف چرچہ تھا۔فانی کی ہمسائیگی،کالج میں جذبی اورآل احمد سرور کا ساتھ مجاز کی شاعری کی لئے اہم موڑ ثابت ہوئے۔مجاز نے شروعاتی شاعری میں اپنا تخلص''شہید'' رکھا۔لیکن بعد میں اسے بدل کر''مجاز'' کہلائے۔

مجاز کی ابتدائی شاعری میں رومانیت کی بھرمار ہے۔لیکن اس میں عیاش طبعی یا نشاط کا عنصر کہیں نہیں ملتا۔ان کی زندگی میں علی گڑھ کا اہم رول رہا۔وہ جب علی

گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے انہیں ہندوستان اور ملک کی عوام سے وابستگی کا موقع ملا۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انھیں ایسی شخصیات کی صحبت میسر آئیں جو ہندوستان کے بیدار مغز اور باصلاحیت لوگ مانے جاتے تھے۔ ان لوگوں میں ''اختر حسین رائے پوری، جاں نثار اختر، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، معین احسن جذبیؔ، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری جیسے ذہین لوگ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام اشخاص ادب، تنقید، افسانہ، شاعری، غرض ہر میدان میں اپنی انفرادیت کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ مجازؔ نے جب ان کی صحبتیں پائیں ان کی شاعری کو ایک راہ مل گئی۔ مجازؔ نے ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے بی۔اے پاس کیا۔ دہلی اور بمبئی میں ملازمتیں کیں۔ لیکن کسی ملازمت میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اُن کی فطرت میں پابندی نہ تھی۔ دہلی کی ملازمت کے بعد لکھنؤ چلے آئے جہاں اُن کے بیشتر ساتھی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان لوگوں میں ''سبط حسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، معین احسن جذبیؔ، حیات اللہ انصاری، احمد علی'' جیسے اہم شخصیات قابل ذکر ہے۔ ان کی صحبتوں اور ملک کے بگڑتے حالات نے مجازؔ کو ''ترقی پسند تحریک'' اور اس کے مقاصد کو سمجھنے میں معاونت کی۔ چنانچہ مجازؔ، جذبیؔ اور اسی طرح کئی اور شعراء و ادبا نے اس تحریک سے جڑنے کا فیصلہ کرلیا اور اس تحریک سے دل و جان سے وابستہ ہوگئے۔ مجازؔ کا شعری مجموعہ ''آہنگ'' ۱۹۳۸ء میں طبع ہوا۔ اسی کو بعد کی کچھ نظموں اور کچھ اور تخلیقات کے اِضافے کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں ''شب تاب'' کے نام سے اسے چھاپا گیا۔ مجازؔ کا ایک اور مجموعہ ''سازِ نو'' ہے۔

مجازؔ تین بار ذہنی دوروں کے شکار ہوئے۔ انہیں ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۲ء

میں ذہنی دورے پڑے لیکن علاج کے بعد صحت یاب ہوگئے۔ ان کی شاعری کا زمانہ گرویدہ تھا۔ اُن کے کلام نے اپنے دور میں مرد تو مرد، عورتوں میں بھی ہلچل مچادی تھی۔ مجازؔ کی شاعری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ طالب علمی کے دور میں ہی اُن کا شمار بڑے شعراء کے ساتھ کیا جانے لگا تھا۔ مجازؔ میں سب سے بڑی کمزوری ان کی مے نوشی تھی۔ مجازؔ کا انتقال دسمبر ۱۹۵۵ء کو دماغ کی نس پھٹ جانے کے سبب ہوا۔ ان کے انتقال کے وقت ان کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ مجازؔ کی مکمل زندگی ۴۴ سال اور شعری عمر تقریباً ۲۵ سال ہے۔

اسرار الحق مجازؔ کی زندگی مختصر لیکن شاعری لازوال ہے۔ مجازؔ کی شاعری اپنے عہد کی ایسی تاریخ ہے جس میں رومانیت، سیاسی ہیجان، زندگی اور ادب کے بدلتے اقدار کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں ترقی پسندی نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی، الفاظ کی روانی، انداز کی سادگی، خوبصورت اور خلاقانہ تراکیب اور استعارے اُردو کی رومانی شاعری ہو یا انقلابی شاعری سبھی میں انبساطیت پیدا کیے دیتے ہیں۔ مجازؔ کی شاعری میں ایک روح نظر آتی ہے ایک پیغام ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی اور قومیت کے رجحانات جا بجا پائے جاتے ہیں۔ وہ کبھی ملک و قوم کو نہیں بھولتے اُن کی نظموں میں بیشتر مقامات پر قوم پرستی اور حب الوطنی کا احساس ملتا ہے۔ مجاز نے ملک و قوم کے لئے جو کچھ کہا دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ان کے اشعار کسی کے بھی دل کو چھو جاتے ہیں۔ شعر گوئی کا انداز نہایت سادہ ہے۔ وہ کلاسکیت سے استفادہ اُٹھاتے ہوئے کتراتے نہیں۔ اُن کی شاعری میں ظلم و جبر، سرمایہ داروں کے مظالم اور انگریزی حکومت کے خلاف شدید احتجاج موجود ہے۔ وہ

شدت پسند شاعر نہیں تھے لیکن جذباتیت میں ان کے برابر کوئی اور شاعر نظر نہیں آتا۔ وہ عوامی ذہن کے اُن تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں جو اُن کی عزت اور وقار سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کی نظموں میں وہ احساس موجود ہے جو اُس کی راہ نمائی انسانیت تک کر سکے۔ وہ ایک ایسے شاعر کے طور پر دکھائی دیتے ہیں جس کے پاس،خیالات کی وسعت، حالات کا ذکر، زبان کی چاشنی، احساس کی لذت، اور زمانے کی حقیقت مکمل وضاحت سے موجود ہے۔ان کی غزلوں میں رومانیت کے وہ دریچے عیاں ہوتے ہیں جس میں حسن کی نزاکت اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے۔وہ محبوب کا احساس انتہائی نفاست اور شرینی سے کرتے ہیں۔اُن کا محبوب نازوں میں پلا، حسن کا پیکر، عادات کا سخی، اور اطوار کا جامع ہے۔مجازؔ اپنے محبوب کو سطحیت کی شاعری سے بہت دور لے گئے۔اُن کا اپنے محبوب سے تعلق بہت پاکیزہ رشتوں میں بندھا ہے۔ان کا معشوق نہ تو بے وفائی کرتا ہے اور نہ ہی عاشق کو ستاتا ہے بلکہ ایک لمسانہ حسین احساس پیدا کیے دیتا ہے جو کہ عشق کو خوب سے خوب تر بنائے دیتا ہے۔

مجازؔ کلاسیکیت کے پرستار تھے۔لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ جدت پسندی کے حامی رہے۔انہوں نے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے نئی جہتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔اُن کی ایک غزل میں اس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
نظر آپ ہی سے ملانا بھی ہے
محبت کا ہر بھید پانا بھی ہے
مگر اپنا دامن بچانا بھی ہے

مجازؔ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ روسی انقلاب سے بہت متاثر تھی۔یہ لوگ اپنے ملک میں بھی ویسا ہی انقلاب بر پا کرنا چاہتے تھے جیسا روسیوں نے کیا تھا۔”ترقی پسند تحریک“ اسی خواہش کا نتیجہ تھی۔اس تحریک کے ساتھ ہر شاعر میں نئے خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ادب کا زندگی سے تعلق پیدا ہو چلا تھا۔اب ہر شاعر کسانوں، غریبوں، مزدوروں کے حالات کا احساس کرنے لگا۔مجازؔ بھی اسی انقلاب کے علمبرداروں میں تھے۔انھیں بھی اس بات کا احساس شدّت سے تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اور غلامی دونوں سے نجات حاصل کرنا وقت کی ضرورت بن چکی ہے۔وہ کسانوں، غریبوں اور مزدوروں کے ساتھی ہیں ان کی نظموں میں اس بات کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔وہ بلا جھجک یہ کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اور غلامی اس ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتی جا رہی ہیں۔

مجازؔ کا اس تحریک سے وابستہ ہونے کا مقصد محض سرمایہ دارانہ نظام اور غلامی کے خلاف جدوجہد نہیں تھا بلکہ وہ ریاکاری اور سماج کی تعمیر کردہ بوسیدہ روایتوں کے بھی سخت خلاف تھے۔انھیں اس تحریک کے تحت ان بوسیدہ خیالات اور کھوکھلے سماج کے خلاف کھڑے ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔انہوں نے اس تحریک سے جڑ کر اپنی شاعری کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیا جس میں محنت، جدوجہد، اور مساوات کے راستے کی ہمواری ہوتی ہے۔وہ ہند کے لئے بے حد حساس دل رکھتے تھے اُن کے پاس مذہبی تفریقات جیسا کوئی عنصر نہیں ملتا۔ان کے پاس ہندوستان کی عوام مظلوم ہے جن کو جدوجہد اور آزادی کی دعوت دینا ان کا مقصد ہے۔انہیں ہر اُس شخص سے محبت اور ہمدردی ہے جو کسی مصیبت کا شکار ہے۔وہ سرمایہ داروں اور فرنگیوں سے سخت نالاں

ہے۔ان کی شاعری میں اس کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

مجاؔز کی نظمیں ادب میں الگ مقام رکھتی ہیں۔ان کی نظموں میں رومانیت کا عنصر نمایاں ہے۔لیکن ان کی انقلابی شاعری اس رومانیت پر غالب ہے۔مجاؔز کی شاعری اپنے دور کی پاسداری اور روایت کا بہترین مظہر پیش کرتی ہیں۔ان کی کُل ۶۰ نظمیں ہیں۔جن میں سے اکثر انقلابی نظموں کا بہترین نمونہ ہے۔ان نظموں میں ''انقلاب ۱۹۳۳ء، سرمایہ داری ۱۹۳۷ء، ہمارا جھنڈا ۱۹۳۷ء، طفلی کے خواب ۱۹۳۷ء، اندھیری رات کے مسافر ۱۹۳۷ء، نوجوان سے ۱۹۳۷ء مزدوروں کا گیت ۱۹۳۸ء، آہنگ جنوں، نوجوان خاتون سے ۱۹۳۷ء، ایک جلا وطن کی واپسی ۱۹۳۸ء، بدیشی مہمان سے، خواب سحر ۱۹۳۹ء، آہنگ نو ۱۹۴۲ء، بول اری بول دھرتی بول ۱۹۴۵ء، مجھے جانا ہے ایک دن ۱۹۴۵ء، پہلا جشن آزادی ۱۹۴۷ء، فکر ۱۹۵۰ء'' جیسی بڑی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں۔ان نظموں میں جنوں کی شدت اور وطن سے محبت کو بے حد شاندار طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔یہ ایسی نظمیں ہیں جو بلند آہنگ ہیں اور ان میں انقلاب لانے اور سرمایہ داری کے خلاف لڑنے کا قصر پھوک دینے کی بات کی گئی ہے۔ان نظموں میں خیال وفکر کی پختگی ملتی ہے۔انہیں صرف جوش دلانے کے لئے نہیں کہا گیا۔مجاؔز کی نظموں کے سلسلے میں ڈاکٹر صدیق محی الدین لکھتے ہیں:

''اس دور کے ایک اہم انقلابی اور رومانی فکر کے شاعر مجاؔز اُردو شاعری میں اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔اُن کی نظموں میں بھی

شدید حب الوطنی اور قومیت کے رحجانات پائے جاتے ہیں۔جس کا انہوں نے دل کی گہرائیوں سے اظہار کیا ہے۔انگریزی سامراج کے خلاف بھی وہ زبردست غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔''

(ڈاکٹر صدیق محی الدین، قومی یک جہتی اور اُردو نظم۔صفحہ نمبر۔۶۴)

مجاؔز کی وہ نظمیں جن میں بغاوت اور انقلاب کا ذکر زیادہ بلند آہنگ ہے ان کا سن تخلیق ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ ہے۔ان کا دور دوسری جنگ عظیم اور فاشزم کے بڑھتے ہوئے حملوں سے ملک کو محفوظ رکھنے، جدوجہد اور آزادی کی جنگ کا زمانے ہے۔مجاؔز نے فاشزم سے دوری برقرار رکھتے ہوئے پاکیزہ پیرائے میں شاعری کر کے دکھلائی جو کہ ادب میں ایک بہترین شاعری کا نمونہ بن چکی ہے۔اپنی انقلابی شاعری سے وہ ملک کو آزادی کی راہ دکھاتے ہیں۔مجاؔز کی شاعری وقت کے تقاضے بھی پورے کرتی رہیں اور جمالیاتی انبساط بھی فراہم کرتی رہیں ہے۔

نظم ''انقلاب'' میں ان کا ایک واضح نظریہ سامنے آتا ہے۔جس کی ابتدائی اشعار مطرب کو مخاطب کر کے کہے گئے۔مطرب یہاں صرف ایک مغنّی اور گانے والا نہیں بلکہ پرسکون، پرمحبّ اور خوبصورت زندگی کی ایک علامت ہے۔مجاؔز نے اپنی نظموں میں مطرب، سرمایہ دار اور مزدوروں کو زندگی کا تضاد ظاہر کرنے کی خاطر جدوجہد کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔مجاؔز کے پاس یہ غلامی سرمایہ داری کی لادی

ہوئی ہے۔ یہ ایک جنگ ہے اور ظاہر ہے کہ جنگ میں لطافت اور حسن کاری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ آگ اور خون کی بارش ہوتی ہے۔ انسانیت کا ننگا ناچ کھیلا جاتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اس کی وضاحت بڑے ہی جامع انداز میں کرتے ہیں۔ اس نظم کے تحت مجازؔ ملک کے حالات سے ہر ایک کو واقف کرواتے اور دشمن کی قوت اور اُس کے خلاف جدوجہد پر اُکساتے ہیں۔ مجازؔ کی نظمیں ایک طرح سے عوامی رجز بن کے سامنے آتی ہے۔ جن میں صرف اور صرف حقیقت کو دخل ہے۔

میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تو
میں نے یہ مانا غم ہستی مٹا سکتا ہے تو

میں نے مانا تیری موسیقی ہے اتنی پر اثر
جھوم اٹھتے ہیں فرشتے تک ترے نغمات پر

تیرے ہی نغمے سے وابستہ نشاط زندگی
تیرے ہی نغمے سے کیف و انبساط زندگی

تیری ہی صورت سرمدی باغ تصور کی بہار
ترے ہی نغموں سے بیخود عابد شب زندہ دار

مجھ کو ترے سحر موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو ترے لحن داؤدی سے کب انکار ہے

بزم ہستی کا مگر کیا رنگ یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صدائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

وہ دشمن کی قوت کا اظہار کرتے ہوئے خاک وہ خون کے سیلاب کو پیش

کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہ ایک رجائی شاعر ہی ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں۔

اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی ، فرق پر رنگ شفق

اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

مجازؔ کی نظمیں اُمید اور زندگی کی خوبصورتی کو اپنے اندر سمیٹے ہوتی ہیں ان کی اس نظم کا اختتام بھی اسی طرح کے اشعار پر ہوا ہے۔ مجازؔ اپنی نظموں میں سرخ آندھی کا ذکر کرتے ڈرتے نہیں وہ کھلے عام اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ سرخ آندھی کچھ نہیں وہی سرمایۂ دارانہ نظام ہے جس نے عوام کے خون، پسینے کو نچوڑا ہے۔ کچھ ناقد انہیں شدت پسند مان لیں تب بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ سرمایہ داروں نے ملک کی حالت کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ نظام اب بدلنا چاہیے۔

دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کردو
آگ کے دوزخ کی بجھادو اسے جنت کردو

نظم ''آہنگ نو'' میں مجازؔ روس و چین کے جانبازوں کا ذکر تعریفی انداز میں کرتے ہیں۔ اس نظم کا لہجہ ان کی نظم ''انقلاب'' سے بالکل مختلف ہے۔ نظم ''انقلاب'' میں جہاں وہ تباہی، خونریزی، حالات کی سنگینی، اور سرمایہ داروں اور انگریزوں کے خلاف کھُل کر کہتے ہے۔ وہیں اس نظم میں وہ ایک تعمیری شکل اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انداز بیحد شاندار اور دل آفریں ہے۔

اے جوانانِ وطن، روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوفِ بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر
رنگِ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے
شورشِ نعرۂ زنداں وطن تم سے ہے
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے
عفتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے
تم ہو عزت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں، احساس تمہیں ہے کہ نہیں

یہ پوری نظم خوبصورت تراکیب اور اثر آفرینی کا بہترین نمونہ بن کر سامنے آتی ہے۔نظم کے بند سے اس فضا کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ وہ آندھی ہے جس کی رَو میں ہر دہقان کا نشیمن ہے
یہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقان کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن کا لہو تک چوس لیتی ہے

یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کر مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے
مبارک دوستوں لبریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کا شانہ

ان کے بے ساختہ اور خوبصورت جملے، مصرعے کی تلخ حقیقت کو جذبۂ تعمیر سے بدل دیتے ہیں جس سے نظم کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔مجازؔ کی ایک اور نظم ''سرمایہ داری'' بھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک بغاوت کا پرچم لہراتی ہے۔اس نظم میں مجازؔ سرمایہ داروں کے مخالف اور عوام کے ساتھ کھڑے ہیں۔وہ اس ظالم نظام کی دیوار کو ڈھا دینا چاہتے ہیں ملک کے نوجوانوں کو اس کے لئے اُکساتے ہیں۔

یہ نظم گہرے سیاسی شعور کے علاوہ اُن کے الفاظ وتراکیب کا خوبصورت پیکر بن کر ادب میں پیش ہوتی ہے۔

سب کا تو مداوا کر ڈالا ، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

ان کی نظموں کا یہ عالم تھا کہ مزدور طبقہ اسے مل کر ایک آواز میں گایا کرتا تھا۔ان کی نظموں میں ''ہمارا جھنڈا''، ''مزدوروں کا گیت'' اور ''بول ارے دھرتی بول''، جیسی نظمیں گیت کے طور پر مشہور ہوئیں۔انھیں مزدور طبقہ بڑے شوق سے گایا کرتا تھا۔مجازؔ کی نظموں کو عوام میں بڑی مقبولیت حاصل رہی۔

اپنی غزلوں کے تحت مجاز نہ تو روایتی عاشق ہیں اور نہ ان کا محبوب روایتی محبوب ہے۔ مجاز وہ شاعر ہیں جنھوں نے عاشق کو سرکشی اور محبوب کو دلبری اور دل نوازی کا ہنر سکھایا ہے۔ ان کی غزلوں میں بیشتر اُن کے اپنے حالات کا ذکر پوشیدہ ہے۔ انہیں کسی سے محبت ہوئی اور وہ محبت ناکام ہوئی یہی اُن کی زندگی اور غزلوں کا شاخسانہ ہے۔ مجاز اپنی غزلوں میں محبوب کے روایتی انداز کو قبول نہیں کرتے بلکہ محبوب سے ایسی راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں جس کا حسین احساس پڑھنے والے کو اپنی دل کی گہرائیوں میں محسوس ہوتا ہے۔

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا
چارہ گری سر آنکھوں پر، اس چارہ گری سے کیا ہوگا
درد کہ اپنے آپ دور ہے تم سے کیا اچھا ہوگا

مجاز کے اس طرز نے ہر ایک کا دل موہ لیا۔ خاص طور سے خواتین مجاز کی شاعری پر مرمٹیں۔ مجاز جس وقت علی گڑھ میں رہا کرتے تھے علی گڑھ کی گلز ہاسٹل میں مجاز پر عاشق لڑکیوں کی بھرمار تھی۔ حتہ کی یہ خواتین مجاز کی معشوقہ بننے کے لئے قرعہ اندازیاں کیا کرتی تھیں جس کا علم خود مجاز کو بھی نہ تھا۔ مجاز نے اُردو کے روایتی عاشق اور معشوق کے تصور کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ وہ کلاسیکیت کو مانتے ہوئے اپنے ہی انداز میں شاعری کیا کرتے اُن کی غزلوں کا انداز اپنے دور کے دیگر شعراء کرام سے بالکل مختلف تھا۔ مجاز کی غزل گوئی کے سلسلے میں شارب ردولوی کہتے ہیں:

"اُردو غزل میں یہ طرز سخن مجاز

سے پہلے نہیں تھا۔ اور اسی طرز سخن نے لوگوں میں گھر کر لیا۔ اردو غزل میں عاشق و محبوب کا جو تصور تھا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت شاید نہیں ہے۔ اُس وقت حسرت موہانی اور بعض دوسرے شعرا کے یہاں اس تصور میں تبدیلی آنے لگی تھی لیکن یہ اشارے صرف کہیں کہیں پر نظر آجاتے تھے۔ مجاز نے محبت اور محبوب کے تصور کو ہی بدل دیا۔"

(شارب ردولوی ، اسرار الحق مجاز۔ صفحہ نمبر۔۱۱۴)

مجاز نے محبت اور محبوب کے تصور کو ہی بدل ڈالا۔ ان کی غزلوں میں وہی رویہ اور اس پر وہی ردعمل ہے جو ایک محبت کرنے والے شخص کا ہوسکتا ہے۔ جس کا محبوب تخیل کی کوئی زہرہ جبیں یا ماہ پارہ ہونے کہ بجائے اسی دنیا کی حقیقی عورت ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجاز کے عاشق میں جرأت و سرکشی کا عنصر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں محبت اور بے تکلف احساس ایک ساتھ موجود ہے۔ جسے مجاز کے ان اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے۔

بہت کچھ اور بھی ہے جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے
بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
سخت جاں ہی نہیں، ہم سرخودسروخوداربھی ہیں
ناوکِ ناز خطا ہے تو خطا ہو ساقی
چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے
حسن کو ناحق پشیماں کر دیا
اے جنوں یہ بھی کوئی انداز ہے
ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجازؔ
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

مجازؔ کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی ان کی اپنے محبوب سے ہم کلامی ہے۔وہ ایسا انداز اپناتے ہے جس سے یہ گماں پیدا ہوا جاتا ہے کہ اُن کا محبوب اُن کے سامنے موجود ہے اور وہ ساری باتیں سُن بھی رہا ہے اور سب کچھ دیکھ بھی رہا ہے۔ان کے اشعار کسی کو مرعوب کرنے کے بجائے چپکے سے دل میں سیندلگاتے ہوئے ،دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔مجازؔ کا عشق صرف گوشت پوست کے محبوب تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی سے عشق،خوبصورتی سے عشق، انسانیت سے عشق،قدرت سے عشق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے اشعار کی تہہ داری پر اگر غور کریں تو ان میں کئی

رنگ ابھرتے نظر آتے ہیں۔غزل لطیف احساسات اور نازک اظہار کا نام ہے۔مجازؔ کی شاعری میں یہ لطافت ان کی فطرت ہی کا حصہ ہے۔وہ جہاں بھی حسن کی رعنائی اور عشق کی واردات کی بات کرتے ہیں وہاں یہ تاثر اور بھی گہرا ہو کر سامنے آتا ہے۔

☆

پز شکِ زمانہ علی سردار جعفری

سرزمین اودھ کے تاریخی شہر ''بلرام پور'' میں ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو علی سردار جعفری پیدا ہوئے۔ بچپن کا بیشتر حصہ ''بلرام پور'' کی ملی جلی تہذیب کے بیچ گزارا۔ ان کے جداعلیٰ ایران کے شہر شیراز سے تعلق رکھتے تھے۔ جعفری کے دادا کا نام ''سید مہدی حسن جعفری'' اور والد کا نام ''سید جعفر طیار'' تھا۔ جعفری کی سات بہنیں تھیں۔ ان کے خاندان میں یہ چلن تھا کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم اپنے شہر ''بلرام پور'' میں دلوا کر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ بھیج دیا جاتا تھا۔ جعفری کا بچپن لکھنؤ کی تہذیب میں گزرا۔ اُن کے خاندان میں ۱۲/ رجب اور عید غدیر کی خاص اہمیت رہی۔ وہ بچپن ہی سے محرم اور دیگر تشیعی روایتوں میں بڑے ہوئے۔ انہیں ذاتی طور پر یہ چیزیں بے حد پسند تھی اپنی خودنوشت میں اس کا ذکر بڑی تفصیل سے کر چکے ہیں۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ایک مولوی آکر انہیں قرآن کے علاوہ

اُردو اور فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جعفری نے ''ماسٹر بشیر'' سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ بلرام پور کے ''لائل کالجیئٹ'' میں داخلہ لیا لیکن ان کا کبھی تعلیم میں دل نہ لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سال برباد ہوئے۔ سردار جعفری کی بہن ''ستارہ جعفری'' نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اسکول کے بعد فرصت کے اوقات میں گھوڑا دوڑانا، پیڑوں پر چڑھنا اور شکار کھیلنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ تیسری جماعت سے چھٹی جماعت تک انہیں ''منشی بدری پرشاد'' نے ریاضی کی تعلیم دی۔ ۱۹۳۳ء میں ہائی اسکول پاس ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ گئے۔ لیکن یہاں سیاسی سرگرمیوں کے چلتے حکومتی مجرم کہلائے۔ ۱۹۳۶ء میں برطانوی حکومت کے خلاف طلباء کی ہڑتال میں شریک ہونے کی بنا پر یونیورسٹی سے نکال دیے گئے۔ بعد کو ''اینگلو عربک کالج'' دہلی میں داخلہ لیا اور یہیں سے بی۔اے پاس کیا۔ کچھ وقت بعد جعفری نے لکھنؤ یونیورسٹی سے پہلے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی اور کچھ وقت بعد ایم۔اے انگریزی میں داخلہ لیا لیکن تعلیم مکمل نہ کی۔

جعفری تعلیمی زمانے سے سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جب وہ لکھنؤ میں قیام پذیر تھے انہیں ملک کے حالات کی سنگینی کا احساس بہت شدت سے ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ بائیں بازوں سے تعلق رکھنے والے کئی ترقی پسند ادبا و شعراء اسی شہر میں جمع ہو چلے تھے۔ ان میں ''سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید سبط حسین، اسرارالحق مجازؔ'' کے نام قابل ذکر ہے۔

لکھنؤ میں جعفری ''نیا ادب'' اور ''پرچم'' رسالہ سے جڑے رہے انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''نوی امیج'' کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔

۱۹۴۰ء میں انھیں حکومت کیخلاف پروپیگنڈا پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ جرم کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل سے ہٹا کر انھیں بنارس جیل بھیج دیا گیا۔ رہائی کے بعد بھی وہ بلرام پور میں نظر بند رہے۔ ۱۹۴۸ء میں سردار جعفری کی شادی اپنی ہی پسند کی خاتون ''محترمہ سلطانہ منہاج'' سے ہوئیں۔ان کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار رہی۔

انکی بے باک اور بے لاگ تحریوں، منظومات اور تقریروں کی بدولت انھیں اکثر جیل جانا پڑا۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی میں بھیڑی کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں جس پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ مہاراشٹر ''مرار جی دیسائی'' نے پابندی لگائی تھی، گرفتار ہوئے اور آرتھر روڈ جیل میں انہیں قید کر دیا گیا۔اس کے بعد بھی وہ ایک دفعہ اور گرفتار ہوئے۔ ۱۹/اپریل ۱۹۴۹ء کو تیسری بار گرفتار ہوئے اور سنٹرل جیل ناسک میں قید رہے۔جعفری عملی طور پر ترقی پسند شاعر اور ملک کی آزادی اور قوم کی خدمت میں خود کو نثار کرنے والے شخص تھے۔

سردار جعفری کا کلام کئی کتب پر مشتمل ہے جن میں ' پرواز ۱۹۴۳ء، جمہوریت (ایک سیاسی مثنوی) ۱۹۴۷ء، نئی دنیا کو سلام ۱۹۴۷ء، خون کی لکیر ۱۹۴۹ء ،امن کا ستارہ ۱۹۵۰ء، ایشاء جاگ اُٹھا ہے ۱۹۵۰ء، پتھر کی دیوار ۱۹۵۳ء، ایک خواب اور ۱۹۶۵ء، پیراہن شرر ۱۹۶۶ء، لہو پکارتا ہے ۱۹۷۸ء، میرا گھوارا (خودنوشت منظوم سوانح حیات)''جیسی تخلیقات موجود ہیں۔

جعفری کو کئی انعامات سے بھی نوازا گیا، جن میں '' سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۶۵ء، پدم شری ۱۹۶۷ء، یوپی اکیڈیمی ایوارڈ ۱۹۷۷ء، مخدوم ایوارڈ، حیدر

آباد ۱۹۸۰ء'' جیسے انعامات قابل ذکر ہیں۔

جعفری نے اپنی شعر گوئی کے طویل سفر میں کئی طرح کی اختراعیت اور جدّت پسندی سے کام لیا ہے۔وہ اپنی نوع کے ان تجربات کا جواز بھی رکھتے ہیں۔ عوامی محاوروں کا استعمال ہو،نظم کی بحروں میں تبدیلی ہو یا شعری لفظیات میں تصرف ان میں روایتی انداز نہیں ملتا۔ یہ کام انھوں نے خاصے اعتماد سے اس لئے انجام دیا کیونکہ اُردو اور فارسی شاعری کے کلاسیکی سرمایہ اور اس کے فنی اسرار ورموز کی شناسی انہیں بچپن میں ہی حاصل ہو چکی تھی۔فنی نکات کے بارے میں ان کی بصیرت دوسروں سے مختلف تھی۔اس کے علاوہ جعفری کہتے ہیں کہ اُن کی آمدنی کا وسیلہ ان کا قلم تھا۔جس کی وجہ سے مطالعہ میں خوب اضافہ ہوتا رہا۔انہوں نے مرزا غالب، میر تقی میر، کبیر اور میرا بائی کے دیوان اور انتخاب مرتب کر کے اپنے مقدمات کے ساتھ اُردو اور ہندی رسم الخط میں شائع کیے۔ یہ ان کا بڑا اہم کارنامہ ثابت ہوا۔اس کے علاوہ ان گنت کتابوں پر دیباچے اور مقدمے لکھے۔جعفری نے تین سو سے زیادہ ادبی اور علمی مضامین تحریر کیے ہیں۔زندگی کے آخری پڑاؤ پر سرطان کے موذی مرض نے اُن کے وجود میں پنجے گاڑ دیے، وہ بے بس ہو گئے۔آخر یکم اگست ۲۰۰۰ء کو اُردو کا یہ جیالا دیدہ ور شاعر اپنی دانشوری کے ساتھ ابدی نیند سو گیا۔لیکن اُن کی تخلیقات نے اُنھیں ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔

پھر ایک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے

اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اُڑ جائیگی

ترقی پسند شعراء کے قافلے کے راہنما، شاعر، ادیب، صحافی، فلم ساز اور سرگرم کمیونسٹ کارکن علی سردار جعفری ادب کے ایسے شہسوار تھے جن کا کلام آج بھی بلند مقام رکھتا ہے۔ان کی فکر کا ایک خاص رنگ تھا جو ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ مظلوموں کی مسیحائی، سماج کے ٹھیکیداروں کے خلاف بغاوت کا الم بلند کرنا جو برسہا برس سے محنت کش عوام کا خون چوستے چلے آرہے تھے اسی طرح دیگر موزی قوتوں کے خلاف قلم اُٹھانا ان کا مسلک رہا۔سردار جعفری کی شاعری کا انداز بے حد شفافیت بھرا اور واضح ہے۔ان کی نظمیں ہو یا غزلیں وہ جو بھی بات کہتے ہیں مکمل وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں تا کہ اصل کو رد کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔جعفری اپنے اشعار بے حد مشاقی اور تندہی کے ساتھ کہتے ہیں۔ان کی نظموں اور غزلوں میں زمانے کی حقیقت اور حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔اپنے ترقی پسند ساتھی شعراء میں کسی سے پیچھے نہیں رہے اُن کا کام اور ملک کے لئے اُن کا جذبہ قابل ستائش ہے۔

جعفری ایک ترقی پسند شاعر تھے ان کے پاس نظم کو وہ مقام حاصل ہے جو کہ اس تحریک سے وابستہ تمام شعراء کی پاس ملتا ہے۔وہ نظموں کی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔اُن کی نظموں میں زمانے کی حقیقت، ماحول کا شعور، حالات کا ذکر اور محبوب سے عشق سبھی کچھ موجود ہے۔ان کی نظمیں بھی ان کی زندگی کی طرح سہ رنگی ہیں۔ جعفری اپنی نظموں میں حقیقت پسندی اور لطافت کے لئے جانے جاتے ہیں۔کسی حقیقی شاعر کے محرکاتِ شعری، کسی خارجی تحریک کی ضرورتوں کے تابع ہوتے ہوئے

بھی اس کے شعوری فکر کے پابند ہوتے ہیں۔عشق کی واردات، عورت اور فطرت کا لازوال حسن، رومان انگیز حادثات اور دوسرے ان گنت واقعات شاعر کے تخیل اور تخلیقی وجدان کے سہارے شعر میں ڈھل جانے والے تجربات کو جنم دیتے ہیں۔اپنی زندگی کے آخری ایام تک انہوں نے اپنی شاعری کا محور نظموں کو بنائے رکھا۔ان کی شاعری اور خصوصاً نظموں کے سلسلے میں مجنوں گورکھ پوری کا قول ہے:

”علی سردار جعفری اور دوسرے نوجوان شاعروں میں مجھے جو ایک اور نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ہمارے اکثر نئے شعرا اب بھی صرف حسرت و محرومی کے شاعر ہیں۔وہ ہمارے اندر نامرادی کا شدید احساس پیدا کر کے ہم کو اپنی موجودہ زندگی سے بد دل تو کر دیتے ہیں لیکن ان کے لہجوں میں مستقبل کی بشارت کی خفیف سے خفیف بھی کوئی ارتعاش محسوس نہیں ہوتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان شاعروں

کے سامنے مستقبل کا کوئی واضح
تصور نہیں ۔لیکن علی سردار
حسرت و حرماں کے شاعر نہیں
ہیں۔وہ ماضی اور حال کو سمجھے
ہوئے ہیں اور مستقبل کا صحیح
اور قطعی درک رکھتے ہیں۔اس لیے
ان کی شاعری مستقبل کی
بشارت لئے ہوئے ہوتی ہے اور
ہماری رگوں میں امید کا انبساط
اور حوصلہ کا جود پیدا کرتی ہے۔''

(مجنوں گورکھپوری،مقدمہ،پرواز،صفحہ نمبر۔۱۶)

نظم نگاری کے لحاظ سے سردار جعفری نے اپنی نظموں میں بے پناہ تنوع پیدا کیا ہے۔ان کی نظموں میں جس طرح کے تجربے ملتے ہیں وہ وقت اور حالات کے نگیں لگتے ہیں لیکن اس میں جدید عناصر کارفرما ہیں۔ان کی نظم نگاری بتدریج ارتقاء کی کئی منازل سے گزرتیں ہے۔انھوں نے اپنے ترقی پسند خیالات کو نظموں میں پیش کرتے ہوئے کئی ہیئتوں مثلاً ''پابند،معریٰ، آزاد،مثنوی،ترکیب بند،اور ترو وتیج بند ''وغیرہ کا خلاقانہ استعمال کیا ہے جس کا مطالعہ بیحد دلچسپ ہے۔جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز ۱۹۴۴ء'' کو منظر عام پر آیا اس میں شامل ''بغاوت،مزدور، جوانی،سماج،مزدور لڑکیاں،سرمایہ دار لڑکیاں،ارتقاو انقلاب، جنگ اور انقلاب،سامراجی لڑائی،کب

تک،فاشٹ دشمن سپاہیوں کا گیت،ترقی پسند مصنفین،بنگال،لینن،انقلاب روس، اور تعمیر نوع''، جیسی قیمتی نظمیں موجود ہیں۔ان نظموں میں اس عہد کے اہم اور ضروری مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ان نظموں کے اظہار کے لئے جعفری نے انقلابی رنگ و آہنگ کا مکمل استعمال کیا ہے۔ان کے عنوانات بھی انقلابیت سے بھرپور ہیں۔

ملک کی جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی اور ترقی پسند تحریک اپنی جدوجہد کو ساتھ لیے آگے بڑھ رہی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس کے زیر اثر لکھے جانے والی نظموں میں آزادی ہند کی جدوجہد کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔جعفری بھی اپنی نظموں میں سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔نیز اشتراکیت،مزدوروں،کسانوں اور مجاہدین آزادی کی حمایت بھی کر رہے تھے۔''پرواز'' میں شامل نظموں ''مزدور لڑکیاں'' اور ''سرمایہ دار لڑکیاں'' کے ذریعے جعفری نے دراصل اس عہد کے حالات کے پیش نظر سرمایہ دار اور مزدور کے اختلافات اور ان کے بیچ کے بنیادی فرق کو واضح کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔نظم ''مزدور لڑکیاں'' میں مزدوروں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں۔

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں
سختیِ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہِ آفتاب
آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب
سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی
سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی

بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب
ساز ان کا سوز حسرت خاموشی ان کا رباب
ان کے ساتھی پھاوڑے، ان کی سہیلی ہے کدال
زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال
لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ
ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ
اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن
دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

جعفری غربت اور مفلسی کی زندگی کو روشنی اور خوشیوں سے پُر کر دیتے ہیں۔ وہ قوم کو ایک اُمید کی کرن دکھلاتے ہیں۔ ان کی شاعری نے اپنے دور میں کئی لوگوں کو اُمید اور حوصلہ دیا۔ انھوں نے سرمایہ داروں اور ان کی عورتوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا۔ نظم ''سرمایہ دار لڑکیاں'' میں ان عورتوں کے لئے کہتے ہیں۔

شہر کے رنگین شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ
نوجوانی کی حسیں خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ
ہے انھیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار
ہے یہی تہذیب کے آذر کدے کی شاہکار
گردنوں کا خم ، کمر کی لوچ ، سینے کا اُبھار

صندلی ماتھوں سے تبخانوں کی صبحیں آشکار
قہقہے سوئے ہوئے جذبے کے لیے
گفتگو ہر سننے والے کو لبھانے کے لئے
اہرمن تو اہرمن ہوجائے یزداں بھی شکار
ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار
عشق کے ذوقِ نظارہ نے نکھارا ہے انھیں
مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں
ڈوب تو سکتی ہیں لیکن پھر ابھر سکتی نہیں
یہ کنارو بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

یہ دونوں نظمیں مثنوی کی ہئیت میں لکھی گئیں ہے۔ ترقی پسندوں نے اس ہئیت کو نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اس کو فروغ بھی دیا۔ جعفری بھی اسی کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور نظم ''ترقی پسند مصنفین'' قابل ذکر ہے۔ اس نظم کو جعفری نے اقبالؔ کی نظم ''یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے'' کی زمین پر تخلیق کیا۔ اس نظم میں اقبالؔ کے رنگ و آہنگ کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح اقبالؔ اپنی نظم میں خدا سے دعا گو ہوئے کہ وہ مسلمانوں میں جستجو کی تمنا پیدا کرے جو اس کی روح اور ضمیر کو جگا دے اور اس کے قلوب کو تڑپ عطا کرے تاکہ ان کے قلوب تیری محبت اور وطن پرستی سے سرشار ہو جائیں۔ کچھ اسی طرح سردار جعفری اپنی اس نظم کے ذریعے ترقی پسند شعراء اور ادیبوں کو غلاموں کی محفل میں آگ لگانے، دل کی بجھی ہوئی شمعوں کو فروزاں کرنے، کعبہ، دیر، حرم، اور کلیسا کی قندیلوں کو بجھانے اور ہر طرف مشرق اور

مغرب میں شمعِ دل کا چراغاں کرنے کی تلقین کرتے دکھائی دیے۔

آگ محفل میں غلاموں کی لگا دیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دیں
کعبہ و دیر و کلیسا کی بجھادیں قندیل
ہر طرف مشرق و مغرب میں چراغاں کر دیں
توڑ دیں وہم نے پہنائی تھیں جو زنجیریں
آ گیا وقت کہ اب وا درِ زنداں کر دیں
مسندِ عیش سے شاہوں کو اٹھادیں چل کر
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کریں

''پرواز'' میں موجود نظموں سے سردار جعفری کے احساس انسانی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس دور میں جذباتیت کے اُس مقام کو چھوتے ہیں جس کا ہر شاعر خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ ان کے اشعار زمانے کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ملک کی عوام بیدار ہو رہی تھیں۔ اُن کی شاعری کا جادو ہر طرف سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ نظم ''بنگال'' کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اٹھتا ہے بخار
میتیں ہیں بے کفن چادر اڑھاتا ہے غبار
چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار
بے بسی سے آج ان کے چوستے ہیں شیر خوار

رینگ کر لاشوں سے ہٹ جائیں یہ طاقت بھی نہیں
ان میں انسانوں کی ہلکی سے شباہت بھی نہیں

اس نظم میں قحط بنگال کی جو تصویر کھینچی گئیں ہے، وہ بہت ہی دلدوز اور جاں کنی کا عالم پیش کرتی ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں قحط سالی کا دلدوز منظر ثبت ہو جاتا ہے۔ ان کے اس لہجے نے تمام ملک کو ایکدم جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

ان کی نظموں میں پرولتاری آمریت، قوم پرستی، نیز مارکسی نظریے سے متاثر سرمایہ داروں کی مزمت اور غریب و مزدور طبقہ سے محبت سبھی کچھ موجود ہے۔

ترقی پسند تحریک سے جہاں اُردو کے اندر نظموں کا بیش بہا اضافہ ہوا وہیں اُردو کی سب سے اہم اور کلاسیکی روایت غزل کو بھی تبدیلی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند شعراء نے غزل جیسی صنف پر مہارت ہونے کے باوجود اُس سے زیادہ تر دوری بنائے رکھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک سے نظم تو خوب پھلی پھولی لیکن غزل کو وہ راستہ مہیا نہ ہو سکا جس سے اُس میں مزید تصورات و تناظرات کو جگہ ملتی۔ ترقی پسندوں نے بیشک فطرت سے مجبور ہو کر غزلیں کہیں ہے لیکن ان کی نظموں نے ان کی غزلوں کو جاذبیت سے دور کر دیا۔ یہی حال علی سردار جعفری کا بھی نظر آتا ہے۔

وہ ایک ایسے ترقی پسند شاعر تھے جنہیں غزل سے خاص شغف نہیں محسوس ہوا۔ کئی دفعہ انھوں نے غزل کی مخالفت بھی کی۔ سردار جعفری نے اگر چہ غزل کی پُر زور مخالفت کی، ابہام کو شاعری کے لیے سمِّ قاتل قرار دیا، فنی لوازم کو ثانوی حیثیت

سے پیش کیا اور مقصد کو اولیت بخشی لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے اوائل ہی سے غزلیں کہیں ہے۔تحریک سے وابستگی کے بعد اُنھوں نے صنف غزل کو محدود کر دیا لیکن جو کچھ بھی فطری لگا اُسے کہے بغیر نہ رہ پائے۔اُن کی غزلوں میں سیاسی ،سماجی ،اخلاقی ،اور تہذیبی موضوعات کو زیادہ دخل ہے۔شاید یہی وجہ رہی کہ ناقدین نے کبھی بھی اُن کی غزلوں پر خاص توجہ نہیں کی۔

اُردو غزل میں زمانے کی حقیقت اور تہذیبی پس منظر کی عکاسی کوئی نئی بات نہیں تھی جعفری سے پہلے ُولی دکنی ،میر تقی میرؔ،مرزا رفیع سوداؔ،شیخ ابراہیم ذوقؔ،مرزا اسداللہ خاں غالبؔ،خواجہ حیدر علی آتشؔ،اور امام بخش ناسخؔ،وغیرہ نے بھی غزلوں میں حقیقت پسندی کا اظہار کھل کر کیا ہے۔جعفری کا المیہ یہ رہا کہ ان کی غزلوں کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا اور بے توجہی برتی گئی۔جعفری کی بیشتر غزلیں کلاسیکی روایات اور اس کی لطافت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔جعفری طبعاً حسن وعشق کے دلدادہ شخص تھے۔لیکن ترقی پسندی نے ان کی غزلوں کے حسن کو دھندلا کر دیا۔جعفری کی غزلوں میں حسن وعشق اور نسواں کے کردار کو ایک الگ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔اُن کے پاس صنف نازک اور اُس کے جذباتوں کی بہت قدر ہے۔وہ حسن وعشق کے لئے کی جانے والی جدوجہد کو بہت سراہتے ہیں۔اُن کے پاس عشق بغیر ناز وانداز کے مکمل ہوتا ہی نہیں۔اس کی مثال اُن کے پہلے شعری مجموعے ’’پرواز‘‘ سے دیکھئے۔

حسن کی رنگین ادائیں ہوتی گئیں
عشق کی بیباکیاں بیباک تر ہوتی گئیں

یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور زیادہ معتبر ہوتی گئیں
زندگانی اپنے نشتر آزماتی ہی رہی
ان کی نظریں بخیۂ چاکِ جگر ہوتی گئیں
لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شہد وشکر ہوتی گئیں

جعفری نے شروعات ہی سے اپنی نظموں کو اپنی شاعری کا بہترین وسیلہ سمجھا لیکن جب غزلوں کی طرف متوجہ ہوئے تو اُن کے پاس وہی روایتی باتیں اور تحریک سے متاثر انداز باقی رہا جس کی وجہ سے ان کی غزلیں کئی لوگوں کے لئے قابل ندرت نہ رہی۔پھر بھی ان کی غزلوں میں جو کلاسیکیت ،روانی ،جذباتوں کی عکاسی ،محبوب سے والہانہ محبت ،موجود ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔

تیری ادائیں ہے ساحرانہ ، ہے تیرے انداز دلربانہ
تو ہی بتادے کہاں سے آئیں گے مجھ کو آدابِ عاشقانہ
حقیر ہو کر نہ رہ سکے گی تیری بلندی سے میری پستی
میں اپنے سجدوں سے کیوں بساؤں تری رعونت کا آستانہ

جعفری کی غزلوں میں شروعات محبوب سے ہوتی ہے لیکن پھر مبہم انداز میں آہستہ آہستہ ترقی پسندانہ شکل اختیار ہوتی چلی جاتی ہے۔جعفری نے حسن وعشق کی جس وادی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا،اسے انھوں نے ترقی پسند تحریک کی سخت گیری کے زمانے میں کلیتاً خیر باد نہیں کہا۔مجازی عشق کے ساتھ ساتھ عام انسانی محبت

کے جذبے کو بھی انھوں نے فروغ دینے کی کوشش کی۔انھوں نے گوشت پوست کی عورت کواس کی صنفی پاکیزگی کے ساتھ اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔

مے ہے تیری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ سا طاری ہے
تیرے قامت کی لرزش سے موجِ مے میں لرزش ہے
نیند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیمانوں کو چھلکائے ہے

مجموعی طور پر سردار جعفری اپنی شاعری میں حسن وعشق سے لے کر سیاسی افکار،فلسفیانہ خیالات،اور سماجی رجحانات کو رمزیت،اشاریت،ابہام،تخیل کی بلندی، احساس شدّت، پیرایۂ بیان کے تحت پیش کرتے ہوئے تنوع پیدا کرتے ہیں۔

☆

اذھابِ ذھن معین احسن جذبیؔ

ترقی پسند تحریک نے آزادی ہند میں جس طرح کا کردار ادا کیا وہ قابلِ ستائش ہے۔اس تحریک نے کئی جواہر پاروں کو آگے بڑھنے میں مدد کی۔جس سے نہ صرف تحریک کو جلا ملی بلکہ اُردو شاعری بھی ترقی کی منازل پر چڑھتی چلی گئیں۔ان شعراء میں ایک اہم نام معین احسن جذبیؔ کا بھی ہے۔

جذبیؔ ترقی پسند تحریک سے تب وابستہ ہوئے جب اس تحریک کا مقصد آزادی ہند اور قوم کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنا تھا۔ابتداء میں جذبیؔ نے اپنا تخلص (ملال) رکھا مگر بعد میں اسے تبدیل کر کے جذبیؔ کہلائے۔جذبیؔ کے کل ۳ شعری مجموعے ہیں۔''فروزاں''، ''سخن مختصر''، ''گداز شب''۔اس کے علاوہ نثر میں انھوں

نے ''حالی کا سیاسی شعور'' جیسی لاجواب تحریر بھی لکھیں۔ وہ خود کی زندگی پر خودنوشت بھی لکھ رہے تھے جو کہ نامکمل ہی رہ گئی۔ جذبی نے جہاں ایک طرف ترقی پسند تحریک کے تحت اپنے اشعار کہے وہیں اپنی رومانی شاعری کو بھی پیش کیا۔ جذبی نے ترقی پسند تحریک کو قبول تو کیا لیکن اپنی رومانی فطرت کو کبھی ضائع نہ ہونے دیا وہ اپنی شاعری میں رومانیت کو بڑے ہی دلکش پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔

جذبی کی پیدائش ۱۹۱۲ء میں قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ (یوپی) میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی زندگی نہایت پریشانیوں میں گزری۔ ادب میں بہت کم ایسے اشخاص ہونگے جنھوں نے تعلیم اور معاش کی خاطر اتنی ٹھوکرے کھائیں ہو۔ جذبی کا بچپن محض ٦ سے ٨ برس کا رہا۔ جذبی جب ۴ برس کے تھے تو والدہ کا انتقال ہو گیا والدہ کے انتقال کے بعد جذبی کو والد، دادی، اور پھوپھو نے انھیں سنبھالا۔ والد چونکہ ایک سرکاری ملازم تھے اس لئے فطرت میں سخت گیری عیاں تھی۔ لیکن جذبی پر کبھی غصہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انکی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی وہ انھیں مختلف شعراء کے کلام زبانی یاد کروایا کرتے۔ یہ عمل انکے ساتھ ٨ برس تک ہوتا رہا۔ جذبی نہ صرف گھر والوں کے حساب سے ڈھلتے چلے گئے بلکہ اسی شفقت و لاڈ کے عادی بھی ہو گئے انھیں پتہ تھا کے والد، دادا اور پھوپھو کس بات پر خوش ہوتیں ہیں۔ ان کے دادا عبدالغفور خود بڑے اچھے شاعر تھے، چاروں پھوپیوں میں بڑی پھوپی اکرام خاتون ایک بڑی ہی اچھی مصنفہ تھیں۔ یوں ایک ادبی گھرانے میں اس لڑکے کی ادبی تربیت کا بہترین انتظام موجود تھا۔

لیکن جیسے ہی ان کے والد نے دوسری شادی کی جذبی کی خوشیاں ایک دم ختم

ہو گئی۔ سوتیلی ماں کو جذبی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ ان خاتون نے آتے ہی باپ، بیٹے میں پھوٹ ڈال دی۔ والد پہلے ہی سخت گیر آدمی تھے اب سوتیلی ماں کے تانوں اور شکایتوں نے جلتی کڑھائی میں گھی کا کام کیا۔ نتیجتاً جذبی کو اپنا گھر چھوڑ ماموں کے گھر جانا پڑا۔ جذبی کا بچپن کم عمری میں ہی ختم ہو گیا۔

جذبی چونکہ ترقی پسند شعراء میں سے ہے۔ عام طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ حضرات کے بارے میں یہ عام رائے ہے کہ انکا ادب مکمل طور پر عوام، اسکے مسائل، اُس کی تکالیف اور اس کے حالات کی عکاسی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ بات کافی حدتک صحیح بھی ہے لیکن جذبی کا معاملہ کچھ اور نظر آتا ہے۔

جذبی کی زندگی بے حد مسائل اور مشکلات میں گذری۔ اس شاعر نے جتنی مصیبتیں جھیلی ہیں اس کا احساس ان کی سوانح کے مطالعہ سے سمجھ آتا ہے۔ لیکن ان کی خوبی یہ رہی کہ انھوں نے اپنے ذاتی مسائل کو کبھی اپنی شاعری کا محور نہیں بنایا۔ وہ اپنے مسائل کا ذکر اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی نہیں کرتے تھے۔

جذبی بطور شاعر کسی حالات کو اس انداز میں سمجھتے اور سمجھاتے ہیں کہ وہ واقعہ مسائل والمناکی کے باوجود شدید ارتعاش نہیں پیدا کرتا۔ بلکہ وہ قاری کے لیے ایک فکری احساس چھوڑتا ہے جس کا تجزیہ شاعر نہیں، قاری کرتا ہے۔

عیش سے کیوں خوش ہوئے کیوں غم سے گھبرایا کیے
زندگی کیا جانے کیا تھی اور کیا سمجھا کیے
مختصر یہ ہے ہماری داستانِ زندگی
اک سکونِ دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کیے

جذبؔی اپنے اشعار سے ایک فہم ایک نظریہ تک رہنمائی کرتے ہیں آگے قاریاس روانی میں بہتا ہوا سوچتا چلا جاتا ہے۔

جذبؔی عام ترقی پسندوں جیسے بالکل نہیں تھے۔ انھوں نے شاعری بہت سنبھل کر کی۔ اپنی شاعری کو سطحیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ وہ عوام کے بارے میں لکھتے ضرور تھے مگر سنبھل کر ٹھہر کر۔ انکے پاس جذباتوں کے سمندر رٹھاٹے نہیں مارتے بلکہ فطری جذبات ہیں جو انسان کی روح کو اس کے نازک احساسات کو چھو کر گزر جاتے ہیں۔

شکوہ کیا کرتا کہ اُس محفل میں کچھ ایسے بھی تھے
عمر بھر جو اپنے زخموں پر نمک چھڑکا کیے
طالب تسکین و ہمدردی تھے بیزاران زیست
ہم فریب جوشِ اُلف یادکر کے ہنس دیے
یہ ہوا کی سنسناہٹ بجلیوں کی یہ چمک
ہوگئے اجزا پریشاں کیا مری فریاد کے

یہ اشعار انھوں نے ملک کے آپسی رنجشوں اور مذہبی اختلافات کے تحت کہے ہیں۔ مسلمانوں کو جس انداز سے ملک بھر میں دیکھا جاتا ہے اس پر گہری فکر کا اظہار کیا ہے۔

ملکی حالات سے مایوس و بیزار دلوں کو وہ جدوجہد کی جانب راغب کرتے ہیں۔ حالات میں تبدیلی آسان عمل نہیں مگر ناممکن بھی نہیں ہے بس جدوجہد کرنی

ضروری ہے اور ہمیشہ کرنا ہی ہوگی نہ کہ تھک کر بیٹھ جانا یا دوسروں کی خوشی اور عیش و عشرت کو دیکھ کر بے چین ہو جانا اور امید کھو دینا۔ یہ وہ نظریات ہیں جس پر جذبؔی نے اپنی گذاری تھی۔ اور یہی فکر وہ شاعری میں بھی پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک آخری نظریں تری مشکل سے پہنچی
وہی منزل کی حد ہے خوابِ منزل دیکھنے والے
دلِ بیتاب کی اک اک تڑپ محشر بداماں ہے
ذرا منہ پھیر لینا رقصِ بسمل دیکھنے والے
ابھی طوفان اٹھتا ہے، ابھی کشتی الٹتی ہے
ابھی ساحل نظر آتا ہے ساحل دیکھنے والے
طلسمِ راہِ الفت اور فریبِ شوق ارے توبہ
ابھی مدتوں بھٹکیں گے منزل دیکھنے والے
مری دقت پسندی دیکھ، میرا مسکرانا دیکھ
نگاہِ یاس سے او میری مشکل دیکھنے والے

جذبی ادب میں کم گو شاعر کے بجائے ایک فلسفی اور فہم گو شاعر زیادہ نظر آتے ہیں۔ آل احمد سرور انکے بارے میں لکھتے ہیں:

"جذبیؔ ایک ایسے شاعر کے طور پر ادب میں قائم ہوئے کہ ادب نا تو انہیں بھلا سکتا ہے اور نا ہی ان کے کلام کو سمجھے بغیر

مکمل ہو سکتا ہے۔یہ شاعر اپنے
اندر ادب و شاعری کے کمال کو
پہنچا نظر آتا ہے۔"

(رسالہ آج کل:۔۱۹۵۶ء)

جذبی اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ان کی شاعری میں ''ابتداء، حشو، اتباع، اجتماعی لاشعور، احتجاج دلیل، ادراک، استعارہ، استقادہ، کنایہ، وزن، موضوع ،موصل، بحر، ،معمّا اور مضمون'' جیسے شعری عناصر بدرجہ اتّم موجود ہیں۔

یہ تمام چیزیں کسی بھی شاعر کو ادب میں اس کا مقام عطا کرتی ہیں۔ جذبی شاعری کے اس علم میں مکمل نظر آتے ہیں۔انکے اشعار عام فہم مگر اتنے جامع ہوتے ہیں کہ ذہنی جھروکوں سے ان کیفیات کو کھینچ لاتے ہیں جس میں انسان کی فطری شگفتگی اورلطیف جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں۔وہ اپنے نفس، شعور، ادراک، اور تجربوں سے سوال کرتے ہیں۔جس کا جواب دیتے وقت وہ ان تمام کی حدود سے انھیں واقف کراتے ہیں تاکہ اصلاحِ نفس ممکن ہو سکے۔اس کے لیے وہ ایسے واقعات کوملحوظ نظر رکھتے ہیں جس سے زمانے کی بے ثباتی کے علاوہ قوم وانسانیت کی محدود سوچ پر گہری اور بڑی عالمانہ باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔انسان کا نفس اسے دنیا کی جانب راغب کرتا ہے اور یہ ایک فطری عمل بھی ٹھہرا۔لیکن نشاط کی خاطر اذیتیں برداشت کرنا جذبی کو فضول اور بے معنیٰ لگتا ہے۔وہ جانتے ہیں کہ یہ حادثات زندگی کے لوازم ہیں۔انھیں کے بیچ گزر کرنی ہے۔اورانسان کے لیے خواہش دنیا فطری عمل ہے لیکن یہ خیالات لاحاصل ہے۔انسان کا سب سے بڑا ساتھی قناعت ہے۔دو جہاں کی کامیابی کی شاعر

کے پاس کوئی معنیٰ نہیں رکھتیں کیونکہ یہ انسان کو خواہشات میں مبتلا کیے دیتی ہیں۔

مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا،اب خواہشِ دنیا کون کرے

اپنی بات کو جواز رکھتے ہوئے وہ مسلمانوں کی تاریخ پیش کرتے ہوئے طنز کستے ہیں کہ جب اس قوم کے پاس سب کچھ تھا تب اس قوم نے کسی سے کچھ نہ لیا اور اب تم ایسی شکستگی کے عالم میں شک وشبہات پیدا کرتے ہو جس سے زمانے بھر میں اس قوم کی سبکی ہوتی ہے۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے

وہ حسن وعشق سے آشنا ہیں اوراس کی ناز ونخروں کو خوب جانتے ہیں لیکن ان کے پاس اُس امکانی خیال کو فوقیت ہے جس میں سوائے رنج وغم کے عاشق کو کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بڑے بیباکانہ انداز میں کرتے ہیں۔

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے

یہ اشعار فنّی لوازمات سے پُر اور قاری کے لئے بڑے پرکشش ہیں۔رومانی انداز ان کی فطرت کا خاصّہ تھا۔ایک ایسا لہجہ جس نے ہمیشہ انکا ساتھ دیا۔

جذبی اپنی رومانی فطرت کو کبھی چھپا نہ سکے۔ انھوں نے عوام کے لئے اور تحریک کے لئے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر جب بات اُنکے لطیف احساسات کی آئی ان کا رومانیت سے بہت گہرا رشتہ نظر آتا ہے۔

داغِ غم دل سے کسی طرح مٹایا نہ گیا
میں نے چاہا بھی مگر تم کو بھلایا نہ گیا
عمر بھر یوں تو زمانے کے مصائب جھیلے
تیری نظروں کا مگر بار اُٹھایا نہ گیا
روٹھنے والوں سے اتنا کوئی جا کر پوچھے
خود ہی روٹھے رہے یا ہم سے منایا نہ گیا
پھول چننا بھی عبث، سیر بہاراں بھی فضول
دل کا دامن ہی جو کانٹوں سے بچایا نہ گیا
اُس نے اس طرح محبت کی نگاہیں ڈالیں
ہم سے دنیا کا کوئی راز چھپایا نہ گیا
تھی حقیقت میں وہی منزل مقصد جذبی
جس جگہ تجھ سے قدم آگے بڑھایا نہ گیا

اس شاعر کے پاس اپنی فطرت سے فراری کے بجائے اس کو قبول کر اس کی اصل کو پیش کرنے کا ہنر دکھائی دیتا ہے۔ جذبی شاعر ہیں اور وہ بھی ترقی پسند شاعر لیکن اپنے رومانوی انداز سے زمانے میں یکتا نظر آئے۔ مجروح سلطان پوری جیسی بڑی شخصیت بھی جذبی اس معیانہ روی کے پرستار اور متبع نظر آتے ہیں۔ جاں نثار اختر، کیفی

اعظمی، اختر ایمان وغیرہ کا بھی ان حضرات میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے جذبی کی اتباع کو بہتر جاناں اور جذبی سے ساری زندگی متاثر رہے۔ یہ شاعر ۳۱ فروری ۲۰۰۵ء کو بروز اتوار شام ۳ بجے اپنی شاعری میں ۲۹ غزلیں، ۲۸ نظمیں، ۸ متفرق اشعار، ۲ رباعیات چھوڑ کر ۹۳ سال کی عمر میں دارِفانی سے کوچ کر گیا۔

☆

جزالت کا شاعر مخدومؔ محی الدین

مخدوم محی الدین کا خاندانی نام ''ابوسعید'' تھا اور کنیت ''حذری'' ۔ تاریخ پیدائش ۳ فروری ۱۹۰۸ء ۔جائے پیدائش تعلقہ ''اندول'' ضلع ''میدک'' حیدرآباد ہے۔مخدوم کی نسبت اللہ کے رسول ﷺ کے مشہور صحابی ''حضرت حذری'' سے ملتی ہے۔والد کا نام ''غوث محی الدین'' تھا۔مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔مخدوم کی تعلیم کا آغاز گھر پر قرآن و ناظرہ اور عربی وفارسی سیکھنے سے ہوا۔اعلیٰ تعلیم کے تحت بی۔اے اور ایم۔اے کیا۔مخدوم کو سیاست، فلمی دنیا، ڈراموں کا شوق رہا اور یہی ان کی زندگی کی مصروفیات بھی رہیں ہے۔مخدوم محی الدین نے ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد میں ''ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد ڈالیں۔اس کے علاوہ ۱۹۳۹ء کو حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کا عمل بھی مخدوم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔مخدوم نہ صرف شاعر تھے بلکہ بہت اچھے

نثر نگار بھی تھے۔ان کی تخلیقات میں ''ہوش کے ناخن'' (نثری تصنیف، ڈرامہ) ہے۔ شعری مجموعہ میں ''سرخ سویرا ۱۹۴۴ء'' (دکن بک ڈپو حیدرآباد) سے شائع ہوا۔ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''گلِ تر ۱۹۶۱ء'' میں (مکتبہ صبا حیدرآباد) سے شائع ہوا ہے۔مخدوم ترقی پسند تحریک سے بیحد متاثر تھے۔مکمل طور پر مساوات کے حامی اور انگریزوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف تھے۔ان کی شاعری کا محور صرف اور صرف ''ترقی پسند تحریک'' ہے۔

جس وقت مخدوم نے ہندوستان میں آنکھ کھولی یہ وقت ہندوستان کے درد وکرب کا دور تھا۔مخدوم ایک حساس شخص تھے بہت جلد محسوس کرلیا کہ ہندوستان کس ظلم وستم کو جھیل رہا ہے۔ان کے حساس دل نے انھیں ملک کے لئے جدوجہد کا پروانہ سنایا اور یہ شاعر ملک ہند کی آزادی اور مساوات کی تحریک سے وابستہ ہوگیا۔مخدوم نے ملکی حالات کو دیکھا، دیگر ممالک کے مقابلہ اسکا موازنہ کیا اور اپنی راہ متعین کی۔

وہ فطری شاعر تھے۔ان کی شاعری میں جذباتیت کا عنصر بہت نمایا ہے۔ اُن کے پاس آرزو ہے، مگر غمِ آرزو نہیں۔حال کی ناآسودگی سے وہ تڑپ جاتے ہیں لیکن خوبی یہ کہ ایک لمحہ کے لئے بھی قنوطیت کے شکار نہیں ہوتے اس کی وجہ اُن کی وہ اُمید ہے جو انھیں خوش آئند مستقبل سے جوڑتی ہے۔مخدوم اُمید سے خوشی اور جدوجہد سے اعتماد حاصل کرتے ہیں۔

مخدوم ایک بہترین شاعر ہیں۔ادب میں اپنی کمیونسٹ فطرت اور شاعری کے تحت جانے گئے۔ان کے اشعار بے حد تیکھے اور باطل پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ انکے اشعار زمانے اور ہندوستان کے عام آدمی کی فطرت اور مسائل سے قدم ملا کر

چلتے ہیں۔ان کی شاعری میں ان باتوں کا ذکر ہے جس کا خود انہیں تجربہ ہوا۔عام آدمی کی زندگی اوراس کے مسائل سے پوری طرح آشنائی رکھتے تھے۔جس کے سبب ادب میں انکوالگ مقام ملا۔مخدوم کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی رہی کہ انھوں نے جذبی کی طرح اپنی رومانی فطرت کوبھی ضائع نہ ہونے دیا۔مخدوم کی رومانی شاعری بھی ان کی بلند نصب العین کے تحت ہے۔وہ رومانیت میں ہوائی قلعہ نہیں بناتے بلکہ حقیقت کی دنیا میں رہ کر یہاں کے مسائل سے جوج کر محبوب اور عشق کو قبول کرتے ہیں۔مخدوم محی الدین کی شخصیت اورشاعری کے سلسلے میں ''ڈاکٹر صدیق محی الدین'' لکھتے ہیں۔

''مخدوم کی ساری زندگی حیاتِ عوامی میں بسر ہوئی ۔اُن کی شاعری بھی قومی یک جہتی اور وطن دوستی کی ترجمان ہے،یوں اُن کی شاعری میں رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کے بعد انہوں نے مکمل طریقے سے خود کو عوامی خدمات کے لئے وقف کر دیا ۔اُن کی شخصیت اور شاعری اسی حقیقت کی ترجمان

ہے،وہ پرانے اور فرسودہ سماجی و معاشی نظام کو بدلنے کے خواہش مند ہیں۔ایک سچے محب وطن کی طرح انقلاب اور آزادئ ہند کے مجاہد ہیں۔اُن کی نظمیں باغی،آزادئ وطن،جہانِ نو،زلفِ چلیپا،سپاہی ،انقلاب،جنگِ آزادی،قید اور چاند تاروں کا بن حبّ الوطنی اور قومی یک جہتی کے بہترین مثالیں ہیں۔''

(قومی یک جہتی اوراُردو نظم،مصنف:ڈاکٹر صدیق محی الدین،ص۔۱۶)

ہندوستانی تہذیب جو کہ صدیوں مختلف مذاہب کا گھر رہا تھا اسے ایک ایسی قوم کا سامنا کرنا پڑا جو کہ صرف اپنی ذات اوراپنی خواہشات کی غلام رہی۔انگیریزوں کواس ملک میں بسنے والے باشندوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔چنانچہ انھوں نے ظلم وجبر کا بازار عام کیا۔ملک کے باشندے ان غاصبوں کے جبر کو برداشت کرنے تیار نہ ہوئے۔مخدوم بھی انہیں میں تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے بغاوت کا پرچم لہرایا۔ان کی شاعری میں جابجا زمانے کے حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔مخدوم کی شاعری میں نظموں کوفوقیت حاصل ہے ان کے کلام میں زیادہ ترنظمیں ہی ہیں۔انھیں

بہترین نظم گو شاعر کے طور پر ہی جانا گیا ہے۔انہوں نے جو نظمیں کہیں وہ ادب میں اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ان کی غزلوں کا انداز بھی نرالا ہے۔

اُن کی شاعری اور نظموں کا محور صرف ہندوستان اور اس میں بسنے والی عوام تھی۔مخدوم محی الدین نے جب بھی اس بات کا احساس کیا کہ ان کے ہموطنوں کے ساتھ زیادتی ہوئی،کبھی خاموش نہ رہے۔انھیں اُن لوگوں سے بے حد اُنسیت تھی جو ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ہمیشہ آزادی کے جیالوں کی قدر کرتے رہے۔اُن کی حوصلہ افضائی کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے بھی رہے۔ ہمیشہ عوام کو آزادی کی جدوجہد کے لئے ابھارتے تھے۔اپنی نظم ''آزادیٔ وطن''میں کھلے عام اس کا ذکر کرکیا ہے بغاوت کا پرچم بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب اس ظلم کو برداشت نہیں کیا جائیگا۔نظم میں قوم کے جیالوں کی تعریف کرتے ہیں جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کا پاسباں وہ تیغِ جوہردارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ اندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے

وہ غلامی کے خلاف واویلا نہیں مچاتے بلکہ وہ جانتے ہیں کہ مرض کتنا موزی ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔اپنی نظموں میں بار بار آزادی کی وقعت کو بتلاتے ہیں۔ اور اس کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش پر راغب کرتے ہیں۔مخدوم اپنی نظموں میں اس طرح کا اضطراب پیدا کر دیا کرتے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو آزادی کی خاطر لڑ جانے کو تیار کر لیتا۔ان نظموں میں ہندوستان کی وہ تاریخ پوشیدہ ہے جس کے تحت آج کا ہندوستان آزادی کی سانس لیتا ہے۔

مخدوم ایک شاعرِ انقلاب مانے گئے لیکن وہ اپنی رومانی شاعری سے دامن نہ بچا سکے ہیں۔وہ رومان پسند شاعر ہیں۔انہوں نے اپنی رومانیت کو بجائے جنس پسندی کے اپنے مقصد آزادیٔ ہند کے لیے استعمال کیا۔

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے،غزل خواں حور ہوتی تھی

یہ اشعار جہاں لطافت کا پیکر اوڑھے حسن کے نشاطیہ کو چھیڑتے ہیں وہیں دوسری طرف قوم کی بڑائی و کبرائی کا پتہ دیتے ہیں۔یہ مخدوم کے کلام کی بہترین خوبی رہی۔وہ بیک وقت رومان پسند بھی ہوتے تھے اور انقلاب پسند بھی۔انہوں نے اپنی شاعری میں زندگی کی ان دو حقیقتوں کو یکجا کر دیا جس میں انسانیت کے لئے محبت اور اپنی ذات کے لئے حق پرستی اور مساوات کا درجہ موجود ہے۔مخدوم شیشے کے محل میں رہنے والے شاعر نہ تھے وہ نہ تو مبالغہ کی زندگی گزارتے تھے اور نہ ہی ایسی شاعری کی۔اُن کی نظموں میں ہندوستان کی عوام بسی ہے جو کہ کسم وپُرسی کے عالم میں بھی خودار اور باشعور ہے۔جس کے پاس کوئی اسباب نہ ہوتے ہوئے بھی یہ قوم جدوجہد

کے لئے تیار ہے۔وہ اپنی نظم ''جنگ آزادی'' میں اس احساس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟
دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی؟
جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا؟
مزدوروں کا جس میں راج نہ ہو
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

یہ اشعار ہندوستان کے آزادی کا جذبہ رکھنے والا کوئی شاعر ہی کہہ سکتا

ہے۔مخدوم کے لیے ترقی پسندی نہ صرف ان کا اوڑنا بچھونا تھی بلکہ وہ اس کی بنیادوں اور حقیقتوں سے مکمل طور پر شناسائی رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ کہا ہے وہ اس تحریک کو سمجھنے اور اس کی روح تک پہنچنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔مخدوم کے سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادب میں ان کا نقطہ نظر بدلا ہوا تھا وہ جس دور سے تعلق رکھتے تھے اس دور میں کلاسیکیت اور رومانیت ہی کو ترجی دی جاتی تھی۔مخدوم نے اپنے بدلے ہوئے نظریے سے بعد کے آنے والوں کے لیے راہِ روشن بنائی۔جس نے نئی نسل کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کیا۔بعد میں آنے والے شعراء ان سے کافی متاثر ہوئے۔جن میں ''نظر حیدری، ظہیر بابر، سلیمان اریبؔ، مکیش، دہقانی، لطیف ساجد، تحسین سروری، عزیز قیسیؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اپنی شاعری کے نظریاتی پہلو کے سلسلے میں خود ''مخدوم محی الدین'' کہتے ہیں۔

''شروع سے میں ترقی پسندی کے ''انسپریشن'' کے تحت شعر کہہ رہا ہوں۔اُس دور میں جب کہ سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد، طبقاتی جدو جہد، ہماری نجی زندگی، عشق، عشق کی محرومیاں سب کچھ شامل ہیں۔ترقی پسندی کے مفہوم میں آفاقیت آگئی تھی۔جنگ اور امن

کو موضوع بنایا، اُردو شعر کو
تنگنائے غزل سے نکال کر دھرتی
پر کھڑا کر دیا۔“

(کلیات مخدوم محی الدین، مرتب فاروق ارگلی، ص۔۶۶)

یہ ہے مخدوم کا نظریۂ شاعری جو کہ اپنے وقت سے کافی آگے کی سوچ ہے۔وہ اُردو شاعری کو محض غزل اور کلاسیکیت کا ڈھیر سمجھنے کے بجائے اسے ایک ایسا ذریعہ جانتے ہیں جو ملک وقوم کو راہِ راست پر لانے اور آزادی کی جدوجہد کا بہترین ہتھیار ثابت ہوسکتی ہے۔

مخدوم کے لئے غزل ایک ذریعہ ہے حقیقت سے روشناسی کا۔ان کے پاس رقیب کی شکایت، ہجر کا رونا، شیخ کی غیبت یا اسی طرح کے روایتی انداز نہیں ملتا۔شاید اس کی وجہ وہ احساس ہے جو ان کے شعور کی رگ رگ میں بس چکا تھا۔وہ ملک کے لئے مختص ہوچکے تھے ان کی شاعری کا محور ملک آزادی اور مساوی حقوق رہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں ہندوستان کے اُن لوگوں کو پکارا ہے جو آزادی کی جدوجہد کر کے ملک کو آزاد کرا چکے تھے لیکن جب غزلوں کی بات آئی ان کا انداز بالکل بدل گیا۔

ان کی غزلوں کی شروعات ۱۹۵۹ء سے ہوتی ہے۔وہ تقسیم ہند اور فسادات سے متاثر شخص ہیں۔اُن کی نظروں میں آزادی ایک ذریعہ تھا جس سے ہندوستان دوبارہ سرخرو و کامیاب ہوسکتا تھا۔لیکن آزادی کے فوراً بعد ہی تقسیم ہند اور فسادات ایسے حادثات ثابت ہوئے جس کا اثر سبھی کو جھیلنا پڑ گیا۔مخدوم بھی اس اثر سے ان چھوئے نہ رہ پائے۔اپنی غزلوں میں مخدوم جو باتیں پیش کرتے ہیں اُس میں ایک

طرف یاس کی جھلکیاں ہیں تو دوسری طرف لطافت اور حسن کی کارفرمائیاں اس انداز سے پیش ہوتی ہے جو نہ تو کلاسیکی انداز ہے نہ مکمل جدّت پسندی۔ان کا عشق بھی ملک، محبوب بھی ملک اور رقیب بھی ملکی مفاد سے جڑا ہے۔البتہ ہلکی ہلکی سی جھلکیاں لطافت و شیرنی کی اس وجہ سے مل جاتی ہیں کیونکہ وہ ایک فطری شاعری تھے۔حسن سے متاثر ہونا ان کے لیے ایک فطری عمل رہا۔اس معاملے میں وہ بس انسانی جذباتوں کو چھو کر گزر جاتے ہیں۔

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
ہر شام سجائے ہیں تمنّا کے نشیمن
گو جام وہی مے وہی میخانہ وہی ہے
ہر صبح مئے تلخیِ ایّام بھی پی ہے

ان کی غزل گوئی کی شروعات کے وقت ”فراق، مجروح، جذبی اور فیض“ جیسے شعراء اس میدان میں اپنا کمال دکھا رہے تھے۔جب مخدوم کی غزلیں منظر عام پر آئیں تب ان کی غزلوں کا موازنہ ان کے معاصرین کے کلام سے کیا گیا اور اسے سراہا بھی گیا۔ان کی غزلوں میں مکمل طور پر اظہار پر توجہ کی گئی ہے۔ان کے کلام میں اظہاراتی اشارے کافی موجود ہے۔ان کی غزلوں میں اُردو کی روایتی شاعری کا عنصر موجود تو ہے لیکن انداز اور جذباتیت نے اسے ایک الگ سانچے میں ڈھال دیا ہے۔غزلوں کی فضا عام روش سے ہٹ کر ہے۔نظموں میں اسلوب کا جو اچھوتا پن، زبان و لفظیات کی تازگی، اور فکر کی جو ندرت ملتی ہے، قریب قریب وہی سب ان کی غزل گوئی میں بھی موجود ہے۔انہوں نے غزل کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ روایتی ہی

ہے لیکن فکر و اسلوب کی تازگی اسے روایتی غزل گوئی سے دور لے گئی ہے۔ان کی نظموں میں الفاظ کا استعمال چونکا دیتا ہے۔لیکن غزلوں میں کہیں پر بھی ایسا کچھ نہیں وہ اپنی غزل گوئی میں فطرت سے دور نہیں رہ پائے ان کے غزلوں میں اپنے اطراف کی منظر کشی نظر آجاتی ہے۔وہ اپنے گردو پیش کے حالات اور مسائل کو اپنے کئی اشعار میں بڑے خلوص اور شدتِ تاثر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ماحول کی بے حسی، زندگی میں حرکت وعمل کی کمی اور جذبہ ایثار و قربانی کے فقدان کو انہوں نے خوب صوت پیرائے میں میں پیش کیا ہے۔

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے
آج کیا ہوگیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

ان اشعار کے تحت وہ اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے زندگی کی حرارت ختم ہو جانے پر افسردہ نظر آئے۔’’آہ کی آواز‘‘ یعنی سدائے احتجاج تک کا بلند نہ ہونا اور نہ ہی ’’زنجیر کا شور‘‘ یعنی بغاوت کے لئے کوئی جنبش کا ہونا انھیں بے چین کیے رکھتا ہے۔ ہر طرف ہو کا ماحول ہے جس میں ملک احساس شکست و ہزیمت کے بوجھ تلے چپّی سادھے کھڑا ہے۔کسی کو آواز تک اٹھانے کا ہوش نہیں کوئی اس خاموشی میں تبدیلی نہیں لانا چاہتا۔سب ڈرے، سہمے، اور بزدل سے ہو چکے ہیں۔ان کی اس طرز کی غزلوں کے سلسلے میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف لکھتے ہیں۔

’’مخدوم کا نظم سے غزل کی

جانب سفر بدلے ہوئی تاریخی اور سماجی حالات اور خود شاعر کے مزاج کی تبدیلی کا ایک ناگریز نتیجہ نظر آتا ہے۔مخدوم تقریباًاربع صدی تک صرف نظم لکھتے رہے تھے۔۱۹۵۹ء میں صنف غزل کی طرف توجہ کی اور مختصر عرصے ہی میں کئی غزلیں لکھ کر غزل کی شاعری میں بھی اپنے لہجے اور اپنی آواز کو شامل کر دیا.........جہاں انہوں نے سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے مسائل اور نئے تجربات بیان کئے ہیں وہیں انہوں نے حسن و عشق کے تجربات کے اچھوتے پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگر انہوں نے کہیں عام اورپرانے عشقیہ تجربات بیان کئے ہیں تو ان تجربات کو بھی ندرت

احساس کے ساتھ نئے انداز میں
پیش کیا ہے۔"

(مخدم کی غزل، رسالہ حلقہ ارباب ذوق، ڈاکٹر سید داؤد اشرف ص۔۶۷)

مخدوم نے بیشتر نامور شعراء کی طرح تحریک کو اپنی ذاتی ترقی کا زینہ نہیں بنایا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایسی دنیا ملتی ہے جو مساوات اور یکجہتی سے پُر ہے۔ ان کے پاس نہ تو بلغ آرائی ہے اور نہ حقیقی دنیا سے راہِ فرار۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اس ملک کے خاطر اپنا سب کچھ قربان کردینے کی ٹھان رکھی تھی۔ اپنی شاعری میں خاص طور سے نظموں میں وضاحت کے ساتھ دلائل مل جاتے ہیں کہ وہ کتنے قوم پرست اور حقیقت پرست انسان تھے۔ نظموں میں کبھی ''آزادیٔ وطن'' کے عنوان سے عوام کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں تو کبھی ''تلنگن''، ''باغی''، ''جوانی''، ''انتظار''، ''قید''، ''چاند تاروں کا بن''، ''جنگ''، ''موت کا گیت''، ''جہان نو'' جیسی نظمیں لکھ کر ہندوستان کے مسیحا اور راہ نما کے طور پر دکھائی دیے۔ یہ شاعر اپنے اندر وہ تمام خوبیوں کو سمیٹے ہوئے تھا جو وقت اور ملکی حالات کو بدلنے کے لئے ضروری تھیں۔ مخدوم محی الدین کی وفات ۲۵/اگست ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ مخدوم اپنی تمام زندگی ملک کی خدمت کرتے کراتے چپ چاپ مالک حقیقی سے جاملے۔ ان کی نظم ''باغی'' کے چند شعران کی زندگی کا آئینہ نظر آتے ہیں۔

برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
رسم کہنہ کو تہہ خاک ملانے دے مجھے

تفرقے مذہب وملت کے مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے

☆

سکندر علی وجؔد
کی شاعری میں مصفاتی عناصر

جیسا کہ لازم امر ہے کہ ہر انقلاب کے لیے کوئی ایسی جگہ یا مقام ہوتا ہے جہاں سے انقلاب کو نہ صرف نظریہ قائم کرنے میں معاونت ملتی ہے بلکہ اس کے لیے زمین بھی ہموار ہوتی ہے یا کی جاتیں ہے۔ اُردو شاعری کے انقلاب میں دکن ایسا ہی مقام ہے جہاں پر اس کی بنیادیں وجود میں آئیں اور اس کی زمین کو بھی ہموار یا گیا۔

دکن میں بھی شہر ''اورنگ آباد'' اپنی الگ شہرت رکھتا ہے۔ اس شہر نے اُردو شاعری کو وؔلی اور سراؔج جیسے شاعر دیئے۔ اسی علاقے ضلع اورنگ آباد کا تعلقہ ویجاپور سکندر علی وجؔد کا مولد ہے۔ ان کا مکمل نام ''میر سکندر علی'' اور تخلص وجؔد تھا۔ وجؔد کی تاریخ پیدائش ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء درج ہے۔ لیکن ایک اور جگہ سال میں تبدیلی ہے اور ان کی پیدائش ۱۹۱۳ء بھی دکھائی گئی ہے۔ وجد کے آبا و اجداد عالمگیر دور میں اورنگ آباد آ بسے

تھے۔ اُن کے والد کا نام ''عبدالغفور'' تھا جو کہ ویجاپور کے اطراف میں کھیتی باڑی کرتے رہے۔ وجد کوئی خاندانی رئیس شخص نہ تھے ان کے والد انتہائی سادلوح انسان تھے۔ اولاد کی تربیت اور دیکھ بھال اُن کی زندگی کا مقصد تھا۔ وجؔد کہتے ہیں کہ اُنھیں وراثت میں بس ایک قدیم مرصع تلوار ملی تھی۔ معتدل گھرانے سے تعلق کے باوجود وجؔد نے تعلیم کا شوق پایا اور بڑے شاعر کے طور پر مقبول ہوئے۔

وجؔد نے ابتدائی تعلیم ''مڈل اسکول'' ویجاپور سے حاصل کی بعد کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے اورنگ آباد چلے آئے۔ وجؔد بیحد ذہین طالب علم تھے۔ خاص طور سے کھیل کود میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے۔ انھیں اورنگ آباد بھا گیا اس علاقے سے اتنی محبت ہو چکی تھی کہ وہ اپنی شاعری میں اس شہر کے حسن و جمال کو پیش کرنے سے کبھی نہ چوکے۔ نظم ''اوراق مصور'' میں اورنگ آباد کی رعنائیوں پیش کیا ہے۔

ترے ہی ساز ہر میں نے سنے نغمے جوانی کے
ترے ماحول میں سیکھے ہیں گُر جادو بیانی کے
تخیل پر مرے منقوش ہے تیری بہار اب تک
مرے آنسو تری الفت کے ہیں آئینہ دار اب تک

ترے در پر بہار نوجوانی چھوڑ آیا ہوں
نیاز و ناز کی پہلی کہانی چھوڑ آیا ہوں

وجؔد اپنی شاعری میں قدرتی مناظر کی کارفرمائیوں کا جب کبھی ذکر کرتے ہیں وہ شہر اورنگ آباد کو ہی اپنا پس منظر بناتے ہیں۔ وجؔد کلاسیکی حسن اور تخلیقی رچاؤ کے ساتھ اُردو شاعری کے آسمانوں میں یوں نمودار ہوئے کہ زمانہ ان کی شاعری کا

گرویدہ ہوا۔ وجدؔ کی شاعری میں عصری مسائل، تہذیبی، تمدنی، تاریخی وثقافتی عناصر کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔

مڈل اسکول کامیاب کرنے کے بعد وجدؔ نے اورنگ آباد کے واحد انٹر میڈیٹ کالج میں داخلہ لے لیا یہ وہ زمانہ تھا جب ''مولوی عبدالحق'' اور ''سید محی الدین'' اس کالج سے وابستہ تھے۔ اس زمانے میں کالج کی تہذیبی سرگرمیوں اور مشاعروں میں ہندوستان کے نامی گرامی شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔ وجدؔ کو ایسا ادبی ماحول میسر آ گیا جس سے اُن کے ذہنی تربیت ہو سکے۔ اورنگ آباد کالج کے مجلّہ ''نورس'' کے بانی ''بابائے اُردو مولوی عبدالحق'' نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دکنی ادب کی تخلیق اور دکنی زبان کے نوادر مخطوطوں کی بازیافت اور اشاعت میں صرف کیا۔ ۱۹۳۰ء میں سکندر علی وجدؔ ''نورس'' کے تعلیمی ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ وجد کم عمری ہی سے ادب اور تعلیم کے شائق تھے ''نورس'' سے تعلق اُن کی ادبی زندگی کے آغاز کے لئے بیحد کارآمد ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز بھی ۱۹۳۰ء ہی سے کیا۔ شروعاتی دور میں اپنا تخلص ''فلکی'' رکھا مگر بعد کو ایک عالم اور بزرگ شاعر ''عبدالرب کوکب'' کے کہنے پر ''وجدؔ'' تخلص اپنا لیا۔ وجدؔ نے ہندوستانی تمدن پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ اُن کی نظموں اور غزلوں میں کلاسیکت کے ساتھ ساتھ ملک اور یہاں کی تہذیب رچی بسی ہے۔

سکندر علی وجدؔ کا نام ہندوستان کے اہم شعراء میں لیا جاتا ہے۔ اُن کی نظموں میں کلاسیکی رچاؤ، نغمگی، خیال آفرینی، قدرتی مناظر، اور منفرد لب ولہجہ سبھی کچھ موجود ہے۔ ان کی شاعری کا خمیر عصری حسّیت اور لطیف انسانی جذبات کے امتزاج سے اٹھا ہے۔ ان کے ہاں فن کا جو مخصوص تصور ملتا ہے وہ اپنے عہد کے مسائل

اور حقیقت سے آگہی کراتا ہے۔ اپنی نظموں کے تحت فنونِ لطیفہ اور ملک ہند کی روایتی پاسداریوں کو پیش کیا ہے۔ ان سے پہلے کسی اور شاعر نے ملک کے عمارتوں، ایوانوں، اور ملک کے قدرتی حسین مناظر کی اتنی اچھی عکاسی نہیں کی۔ رقص، موسیقی، اور سنگ تراشی کے موضوعات پر وجدؔ کی متعدد نظمیں ملتیں ہے جو فنون لطیفہ سے ان کی غیر معمولی شغف کی ترجمان ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں مخصوص نظریہ رکھتے ہے۔ ان کی نظموں میں وارفتگی، جوشِ تخلیق کا احساس، انسانی فطرت کی نبض شناسی اور زندگی کی کسک موجود ہے جو ایک جاوداں تخلیق ثابت ہوتی ہے اور حلقہ شام وسحر سے نکل کر تاریخ وثقافت کا اَن مِٹ نقش بن جاتی ہے۔

کمند گردش ایام کے اسیر نہیں
نقوش دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں
زمانے کی جبیں پر نقش چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائینگے شاہوں کے
گلشن طراز خون دل حسن کار ہے
اس باغِ بے خزاں میں ہمیشہ بہار رہے

وجدؔ کی نظموں سے متعلق ڈاکٹر صدیق محی الدین لکھتے ہیں۔

''سکندر علی وجد اپنے کلاسیکی
حسن اور تخلیقی رچاؤ کے ساتھ
اُردو شاعری میں نمودار ہوتے
ہیں۔ اُن کی شاعری میں عصری

مسائل ،تہذیبی ،تمدنی،تاریخی و
ثقافتی عناصر کا امتزاج حسین
انداز میں ہوا ہے۔‘‘

(ڈاکٹر صدیق محی الدین،قومی یک جہتی اور اُردو نظم۔صفحہ نمبر۔۷۹)

وجدؔ اپنے دل پر غلامیِ وطن کا داغ لئے ہوئے ہیں۔اُن کی نظمیں جذبہ حب الوطنی اور آزادی کے شوق اور قوم کی بے بسی کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہیں۔ان کی اہم نظموں میں ’’ارادے‘‘،’’صبحِ نو‘‘،’’آفتابِ تازہ‘‘،’’ایلورہ‘‘،’’نیا دور‘‘،’’اجنتا‘‘، ’’آثار سحر‘‘اور’’نذرِ وطن‘‘خاص اہمیت کی حامل ہیں۔وجدؔ اپنی نظموں میں اُمید و روشنی کے ایک نئے نظام کی بات کرتے ہیں جو تمام ملک میں راحت،امن چین مہیا کر سکے۔نظم’’صبحِ آزادی‘‘ میں اس نئے نظام کی آمد کی بشارت کچھ یوں دیتے ہیں۔

خلعتِ تہذیب کہنہ ہو رہا ہے تار تار
اک نئے سانچے میں ڈھلنے کا زمانہ آگیا
ہوگیا ہے آگ تپ تپ کر غلاموں کا لہو
اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آگیا
اہلِ زنداں کو مبارک ہو فروغ صبحِ نو
قید ذلت سے نکلنے کا زمانہ آگیا

ان کی نظمیں جوشیلے انداز اور اخوت سے پُر ہیں۔ان کی شاعری میں وطن سے محبت،ایک دوسرے کی لئے بھائی چارا،اور اقوت کا پرچار نمایاں طور پر ملتا ہے۔وہ

ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ملک کے آزادی کے بعد کے دنوں کی خوبیوں اور آزاد ملک میں سانس لینے کو لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں۔اس کی مثال نظم’’آفتاب تازہ‘‘ ہے جس میں آزادی ہند کا استقبال ہے۔

اک دلنواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا
نخل اُمید اہلِ نظر بار ور ہے آج
محسوس ہو رہا ہے انوکھا سہانا پن
اک سادہ جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج
سوداگرانِ طوق و سلاسل چلے گئے
اے وجدؔ ! لطف عرض متاعِ ہنر ہے آج

اسی طرح ایک اور نظم’’نذر وطن‘‘ میں وجد اپنی تاریخ وقوم کی پہچان کرواتے ہیں۔انھیں اپنے اسلاف پر فخر ہے۔وہ ملک کے تمام قوموں کو یکساں سمجھتے ہیں۔اور اس عظیم ملک کے روایات اور تاریخی ورثے کی وضاحت کرتے ہوئے وطن کی آزادی کے لئے اپنے ہی انداز میں گویاں ہوتے ہیں۔

نظر نواز ہے انداز ترے پر چم کا
فضا میں نور فشاں ہے پیام گوتم کا
سیاہ دورِ غلامی خیال و خواب ہے آج
بلند عظمتِ انسان کا آفتاب ہے آج

ہر لفظ کی مجرد حیثیت ہوتی ہے اور وہ شعر میں بے سروسامانی کی حالت میں داخل نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ معنیٰ کی ایک وسیع کائنات موجود ہوتی ہے۔جسے

وقت اپنے دور کے نئے امکانات کے ساتھ روشناس کرواتا جاتا ہے۔ وجؔد کی نظموں کے الفاظ اپنے دور اور تمدن کی ترجمانی بخوبی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں نے جہاں ایک طرف تمام دنیا کو ہندوستان کی تاریخ سے روشناسی کروائی وہیں دوسری طرف ملک کی عوام کو یکجہتی اور مساوات کا پیغام سنایا ہے۔

وجؔد کی شاعری کو نظم یا غزل کے دائرے میں باٹنا ممکن نہیں۔ ان کی کئی نظمیں غزل کی ہیئت میں بلکہ تغزل کے سانچے میں ڈھل کر رمزیت کی لطافت اُڑھے ہوئی ہے۔ اسی طرح ان کی بیشتر غزلیں تسلسل اور خیال و تاثر کی جدّت کے لحاظ سے نامیاتی کل کی طرح ہیں اور غزل کے روایتی انتشار کا شکار نہیں ہوئیں۔ اسے ان کی فنکارانہ فراست سمجھنا چاہیے۔ ان کی اس شعریت کا عکس ان کے اشعار میں نمایاں ہے۔

۱)

کبھی چھیڑ دیتا ہوں سازِ خموشی
کبھی حسن گفتار سے کھیلتا ہوں

۲)

متاعِ سخن کے جواہر سجا کر
نگاہِ خریدار سے کھیلتا ہوں

۳)

ترتیب سے محفوظ ہیں رنگین بہاریں
گلدستۂ اوراقِ مصوّر ہے تری یاد

ان کے یہ اشعار صنّاعی کے مظہر ہیں۔ سخنوری کے ساتھ خموشی کی قیمت سمجھنا بڑی چیز ہے۔ کیوں کہ خموشی خود سے تعلق بھی ہے اور تعلق کا مصدر بھی، موسیقیت کا راز بھی۔ وجؔد کے تکلم میں خموشی کے یہ وقفے ''شبِ زندہ دار'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے شعری رویے میں شگفتگی، تازگی، طربیہ کیفیت، اور نشاطیہ لہجے کے ساتھ حسن پرستی کے اشارے ہیں۔ ان کے مصرعوں میں ان کا شاعرانہ مزاج، مستی میں لب وقلب کی ہم آہنگی، سخن جوئی میں عمر بھر کا ریاض، داخلی آگ اور رخِ یار کے ہر پہلو کو کمال کے آئینے میں دیکھنے سے فطری مناسبت ہے۔ ان کی غزلوں میں جدید تجربوں کو چونکا دینے والی کیفیت، بے محابا جذبات کے اظہار کی آتش فشانی موجود ہیں۔ ساتھ ہی طنز، تلخی، کا اظہار مبہم انداز میں ملتا ہے۔

☆

جاں نثار اختر اپنے فن کی روشنی میں

جاں نثار اختر کی پیدائش ۸/فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار میں ہوئی۔ والد کا نام ''مضطر خیر آبادی'' تھا۔ جو کہ اپنے علاقے کے بڑے شاعر تھے۔ جاں نثار کی ابتدائی تعلیم گوالیار کے ''وکٹوریہ اسکول'' میں ہوئی وہیں سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا۔ بعد کو علی گڑھ میں داخلہ لیا اور سائنس اور بیالوجی سے انٹر میڈیٹ کا امتحان ۱۹۳۴ء میں پاس کیا۔ انھوں نے پہلے انگریزی اور فلسفہ سے بی۔اے کا امتحان دیا۔ اور بعد میں بی۔اے (آنرز) اُردو سے ۱۹۳۷ء میں کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ایم۔اے اُردو ادب میں درجہ اول سے کامیابی حاصل کی۔ ۲۵/دسمبر ۱۹۴۳ء کو جاں نثار اختر کی شادی، مجاز لکھنوی کی حقیقی بہن ''صفیہ بیگم'' سے ہوئی۔ اختر کو ایک ایسی رفیق حیات کا ساتھ ملا جو کہ پڑھی لکھیں اور سمجھدار خاتون تھیں۔ صفیہ بیگم کا گھرانہ معاشی خوشحالی، زمیندارنہ

تمکنت، نفاست، سلیقگی، خوش مزاجی کا گہوارہ تھا۔ ان کے اندر وہ تمام خوبیاں تھیں جس کی اُمید ایک شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے۔ ان دونوں کے مزاج میں بہت ہم آہنگی تھی جس کے سبب اختر کو کبھی کسی گھریلوں مسئلہ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

علی گڑھ سے اُردو ایم۔اے پاس کرتے ہی انہیں علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اختر علی گڑھ میں شاعر کے حیثیت سے بہت مقبول ہوئے۔ ان کی نظمیں علی گڑھ میں ہر دلعزیز رہیں۔ کچھ وقت بعد گوالیار اور پھر بھوپال کے ''حمیدیہ کالج'' میں اُردو کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کی کوششوں سے بھوپال میں ''ترقی پسند ادیبوں'' کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی وجہ سے ان پر حکومتی عتاب نازل ہوا۔ انھوں نے نوکری چھوڑی اور بمبئی کی فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کے لئے چلے گئے۔ اس دوران بیوی، بچوں کو لکھنؤ میں چھوڑا۔ بمبئی میں طویل مدت تک جدوجہد کے بعد فلمی دنیا میں کامیاب ہوئے۔ کئی فلموں کے گانے لکھے اور ''بڑی بہو'' جیسی مقبول فلم بنائی۔ آخری دور میں اُن کی شاعری میں نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی مثالیں ''پچھلے پہر'' کی غزلوں اور ''گھر آنگن'' کی رباعیوں میں ملتی ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸/اگست ۱۹۷۶ء میں ہوا۔

۱۹۲۶ء میں جب وہ محض ۱۳ برس کے تھے انھوں نے اپنی پہلی غزل کہی۔ اور محض ایک ہی برس کے عرصہ میں ۲۰ سے ۲۵ غزلیں کہہ ڈالیں۔ ان کی شروعاتی شاعری کی اصلاح اُن کے والد ''مضطر'' کیا کرتے تھے۔ کچھ وقت بعد اُن پر ترقی پسندی کے اثرات پڑتے گئے اور اُن کی شاعری میں پختگی آتی گئی۔ جاں نثار اختر کا شمار ترقی پسند تحریک کے اچھے شعراء میں ہوتا ہے۔ رومانیت سے مارکسیت کی جانب ان کے ذہنی

سفر کے نقوش ان کی تخلیقات میں بآسانی مل جاتے ہیں۔اختر بنیادی طور پر ''نظم'' کے شاعر تھے۔لیکن دوسری شعری پیکروں مثلاً غزل، رباعی، قطعات اور شخصی مراثی پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ان کی شاعری نظر سے نظریہ تک کی شاعری ہے۔ان کے کلام کے مجموعوں میں ''سلاسل''، ''جادواں''، ''تار گریباں''، '' خاک دل''، ''گھر آنگن''، ''پچھلے پہر'' ہیں۔

جاں نثار کی شاعری کا آغاز ان کے ہمعصروں کی طرح رومانیت ہی سے ہوا۔''سلاسل'' اور ''تار گریباں'' اسی طرح کی شعری کاوشیں ہیں جس میں ہلکی پھلکی رومانی اور جذباتیت سے سرشاری موجود ہے اس میں کسی نظامیاتی نظریہ کو بالکل دخل نہیں۔ان کی شروعات شاعری میں ''ناہید'' اور ''انجم'' جیسے کرداروں کا ذکر جا بجا مل جاتا ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری رومان اور انقلاب کا بہترین نمونہ ہے۔مساوات، یکجہتی، اور اشتراکیت ان کی شاعری کے بنیادی نظریات میں شامل ہیں۔اس شاعر کو سرمایہ داروں کے ظلم، جاگیردارانہ نظام، اور انگریزی حکومت سے سخت نفرت تھی۔وہ اپنی نظموں میں ہمیشہ اس کی مذمت کرتے رہے۔جاں نثار ہندوستانی روایت اور اس کے ورثہ کے امین ہے۔انھیں اس ملک سے بے پناہ محبت ہے۔ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔اختر کی شاعری انھیں سچا محبّ وطن ثابت کرتی ہے۔وہ ترقی پسند تحریک کے پیروکار تھے۔ان کی زیادہ تر نظمیں اسی تحریک کے نظریات کو پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ان کی نظموں میں ملک کو غلامی سے نجات دلانا، غربت اور افلاس کا خاتمہ، غریبوں کا ساتھ مساوات کا سلوک، صالح معاشرہ کا

قیام جیسی باتیں موجود ہیں۔

ان کے کلام میں ''وہ دِن آئے گا ہمدم''، ''تابِ سخن''، ''مورخ سے''، ''میں اُن کے گیت گاتا ہوں''، ''دانا راز''، ''پانچ تصویریں''، ''امن نامہ''، ''زندگی'' ''بیدار ہے انساں ابھی نہیں''، ''اے اہل وطن''، ''مسافر''، ''جہاں میں ہوں''، ''ریاست''، ''پانچ تصویریں''، ''ستاروں کی صدا''، ''معلوم نہ تھا''، ''سجاد ظہیر کے نام''، ''ترقی پسند مصنفین کے نام''، ''پیغام روس کو سلام'' جیسی اہم نظمیں شامل ہیں۔

انھوں نے ان نظموں کے تحت اُس دور کے حالات اور مسائل کی عکاسی کی وہ ترقی پسند شاعر تھے پھر کیونکر اُن لوگوں کے حالات کا ذکر نہ کرتے جو کسم پرسی کی حالات میں اپنے ہی ملک میں غربت، افلاس، اور غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔اختر جہاں زمانے کی حقیقتوں سے روشناسی کرواتے ہیں وہیں ملک کی عوام کو راہ نجات بھی سُجھاتے ہیں۔وہ اُن تمام کی رہنمائی کرتے ہیں جو اس ملک میں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔اپنی شاعری میں دوسرے ممالک اور اس میں موجود عام لوگوں کی جدوجہد کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے عوام کو آزادی کی جدوجہد کے لئے تیار کرتے ہیں۔

ارتقاء وقت کا فرمان سناتا ہے چلو
ہر قدم ماؤ ہمیں راہ دکھاتا ہے چلو
اسٹالین ہمیں منزل پہ بلاتا ہے چلو

نظم ''مورخ سے'' میں دنیا کی تاریخ کے مختلف ادوار، سیاسی نظام کے تحت انسانیت کی رسوائی، قتل و غارت گری، اور خونی داستانوں کا ذکر بڑے واضح انداز میں

کرتے ہے۔

ملک گیری کی ہوس میں ، مذہبوں کے نام پر
ہو چکی دُنیا میں کتنی بار تیغیں بے نام
جانتا ہے تو کن شہزادیوں کے عشق میں
لٹ گئے ملک وحکومت ہو گئیں قومیں تمام
نادر و چنگیز کی خوں ریزوں کے سوا
تو اگر چاہے تو گنوا دے ہزاروں قتلِ عام

ان کی بتائی ہوئی باتیں زمانے کی حقیقت ہے۔لیکن دنیا کی تاریخ ہمیشہ بدلتی ہے۔اس میں سماجی، سیاسی،اورفکری وتمدنی تبدیلیاں آتی رہتیں ہے۔وہ سائنسی دور سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کچھ لوگوں نے اس کا صحیح استعمال کیا ہے تو کچھ نے غلط۔انسانی سماج میں بندہ وآقا کا امتیاز سائنسی تمدن کا انقلاب اور سرمایہ داری کا ظہور اورطاقت ور کا کمزور پر جبر قابل غور تاریخی باتیں ہے۔وہ ان امور پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کے حساب سے ان باتوں پرغور کرنے کی ضرورت ہے۔

کیوں ہوا دُنیا میں سائنسی تمدن کا ظہور
کس لیے قائم ہوا سرمایہ داری کا نظام
کس طرح سرمایہ داری اپنی قوت کے لیے
خون مزدور کے پیتی رہی گل رنگ و جام
کس طرح سر مایہ و زر کی برآمد بن گئی
بے خبر ملکوں کے گلشن میں شہنشاہی کا دام

کس لئے محکوم قومیں ہو گئیں بیدار آج
توڑنے اٹھے ہیں کیوں صدیوں کی زنجیریں غلام

وہ اپنی شاعری میں روشن مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔یہ شاعر کسی کو بھی محکوم یا غلام نہیں دیکھنا چاہتا۔ان کے مطابق سائنس و دیگر علوم نے محکوموں اور غلاموں میں شعور پیدا کیا ہے۔اور یہ تمام دنیا کے لئے ایک خوش آئین بات ہے۔وہ ملک کی یکجہتی اور ملک کی خاطر جدوجہد ہر ہندوستانی کا فرض اولیں سمجھتے ہیں۔وہ اپنے ہموطنوں سے خواہشمند ہیکہ ملک کو یکجہتی وامن کا گہوارہ بنا دے۔نظم ''امن نامہ'' کے کچھ بند قابل ذکر ہیں۔جس میں وہ ملک کی عظیم روایت کی حفاظت اور بقا کا عزم کرواتے ہوئے صدیوں سے چلی روایت کی پاسداری وحفاظت کا اعادہ کرتے ہیں۔ان کے مطابق ہر ہندوستانی کا یہ فرض اولیں ہیکہ وہ ایک دوسرے کی مذہبی ،لسانی،تمدنی،اورسماجی زندگی کے مظاہر کا احترام کرے۔

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
سلامت تہیں اپنے دشت و دمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن

رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ
چمکتی خنک چاندنی نرم دھوپ
جھلکتی رہے یہ اشوکا کی لاٹ
یہ گوکل کی گلیاں یہ کاشی کے گھاٹ
لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ
یہ صبحِ بنارس ، یہ شامِ اودھ
نہاتا تھے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج

وہ جذبہ حب الوطنی سے عوام کو جوڑنا چاہتے تھے۔ملک میں پھیلی مذہبی منافرت سے عوام کو روکتے رہے۔ ہمیشہ یکجہتی اور اقوت کا پیغام دیتے رہے۔ان نظریات پرڈاکٹرصدیق محی الدین کہتے ہیں۔

”ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک اہم شاعر جاں نثار اختر کی شعری خدمات رومان اور انقلاب کا بہترین مظہر ہیں۔اشتراکی نظرئیے سے اُن کی وابستگی اُن کے فکر و فن کا حصہ بن چکی ہے۔وہ سرمایہ داری ، محکومیت، اور ہندوستان پر انگریزی قبضے کی

بھی مذمت کرتے ہیں۔وہ ہندوستان کی قدیم روایت اور اسکے عظیم ورثے کے گیت گاتے ہیں۔ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اُن کی شعری فکر کا اہم جُز ہے۔وہ ایک سچے محبّ وطن ہیں۔اس دور کے سبھی ترقی پسند شعرا کا ایک مشترکہ مقصد تھا،ملک کو غلامی سے نجات دلانا،سماج میں عدل و انصاف قائم کرنا،معاشی عدم مساوات کو ختم کرنا او ر ایک خوشحال اور ترقی یافتہ صالح معاشرہ کا قیام عمل میں لانا ،اس لحاظ سے جاں نثاراختر کی شعری تخلیقات انفرادی اہمیت کی حامل ہیں۔“

(ڈاکٹرصدیق محی الدین،قومی یک جہتی اوراُردو نظم۔صفحہ نمبر۔۶۵)

ان کی نظمیں نہ صرف زمانہ اور ماحول وسماج کی عکاس ہیں بلکہ مشعل راہ بن کربھی سامنے آتی ہے۔جاں نثار کے نظموں میں وہ روانی اور جذباتیت کا بہترین

امتزاج موجود ہے۔وہ اپنی نظموں میں مقصدیت کومقدم رکھتے ہیں۔ ہمیشہ قوم کے ہمدرداورعوام کے مخلص دوست ثابت ہوئے۔

ان غزلیں،قطعات اور رباعیاں سبھی لا جواب ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی نظموں نے انھیں شہرت کی اونچائیاں بخشی،لیکن غزلوں اور رباعیوں کا انداز بھی کسی سے کم نہیں۔ جاں نثاراختر اُن شعراء میں شمار ہیں جوقدامت سے انکارکرتے ہیں جن کی خاموشیاں بھی تھکن کے بجائے فکر کی بلاغت سے معمور ہیں۔اختر اُن معدودے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں جوزندگی کے بارے میں شاعری نہیں کرتے بلکہ شاعری کو زندگی جان کر گزارتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ،نرمی،تڑپ، فکری بالیدگی، لطافت اورمعصومانہ حیرت سبھی کچھ موجود ہے۔ان کی غزلوں کے سلسلے میں محمد حسن کہتے ہیں۔

”جاں نثار کے نئے لب و لہجے کا راز یہی بے پایاں گداز ہے جس میں نرمی اور بانکپن تو ہے مایوسی اورمحرومی کا ماتم بہت کم ہے .جاں نثار زندگی کو عمر کی اس منزل سے دیکھ رہے ہیں جب اسے ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے اور بھرپور انداز سے دیکھا جا سکتا ہے۔سہ پہر کی دھوپ کی

طرح اس میں اداسی بھی ہے اور حسن بھی۔جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو ایک بندھے ٹکے زاویوں سے الگ کر کے سکّہ بند رد عمل Stoke Respnose سے دور ہٹ کر دیکھا ہے اور مشاہدے بلکہ تجربے کو بے اختیارانہ بیان کرنے کے لیے ایک نیا شگفتہ اور جاندار سر مایۂ ایجاد کیا ہے ۔یہ ”ایجاد“ انھیں معنوں میں ہے جن معنوں میں میرؔ نے اپنے شیوۂ گفتار کو اور غالبؔ نے اپنی مکتوب نگاری کے اسلوب کو خاص اپنی ایجاد بتایا تھا۔“

(محمد حسن،انتخاب کلام: مجاز، جذبی، جاں نثاراختر۔صفحہ نمبر۔۴۸)

ان کی غزلوں میں رومانیت اورحسن پرستی ایک ساتھ سموئی ہے۔وہ حسن کی پیکر تراشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔خصوصاً ان کی آخیر دور کی غزلوں نے انھیں دوسرے شعراء سے جدا کردیا۔”غزل“ کلاسیکی فن ہے۔اس میں ”ایجاز“ ایک مشکل

مرحلہ ہے۔اختر نے اس میں اپنے انداز سے اضافہ کر کے اپنے معاصرین میں سرخروئی حاصل کی ہے۔جاں نثار اختر کی اس ندرت کا راز کیا ہے؟ اسے جان لینا آسان ہے،لیکن بیان کرنا دشوار۔ان کی غزلوں میں احساس کا کھرا پن صاف محسوس ہوتا ہے۔

پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا اور اب
ایک آدھ بات فرض کرنے لگا ہوں میں

اپنے آپ پر بھروسا اور لگن سے منزل کی تلاش ان کے پاس موجود ہے۔کسی سے دب جانا یا غلامی کا ڈر ان کے پاس نہیں بلکہ یہ عناصر انھیں بیباک بنا دیتے ہیں۔

سوائے گردِ ملامت ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانہ کے ساتھ چلنے کا

بے خبری جو کہ انسان کو سیکھنے کا موقع اور راحت کی فراہمی کے قریب کرتی ہے۔

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
بڑی مشکل سے میاں بے خبری آوے ہے

شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص احساس کے مہر بند راستوں سے بچ نکلنا بڑی جوکھم کا کام ہے۔غزل کا ایک زمانہ تھا جب اس میں جنوں اور رجائیت کی حکمرانی تھی۔ہر موضوع پر نہیں تو ہر رویے پر یہی مہرے لگیں تھیں۔پھر وقت گزرا اور اب وہ زمانہ آیا کہ لوگ ذات اور محرومی کے فلسفیانہ خول میں ایسے ڈوبے کہ اس مہر بند رویوں تک جا پہنچے۔اختر ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ان دونوں پہلوؤں سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔یہ غزل کا ایسا فارم تھا جو روایتی غزلوں سے ہٹ کر ہوتے

ہوئے بھی اسی کی پاس داری کر رہا تھا۔اختر کو اس بات کا خاص طور پر احساس تھا کہ پرانی روایتیں اور پاسداری آج کے سماج میں کچلی جا رہی ہیں۔وہ جانتے تھے کہ قدیم ضوابط اور کل کے عقیدے آج کے انسانوں کے لئے کچھ معنیٰ نہیں رکھتے ہیں اس سلسلے میں وہ یوں کہتے ہیں:

۱)

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

۲)

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

ان کی غزلوں میں ایک مقدس کرب موجود ہے جو انھیں بے چین کیے رہتا ہے۔یہ کرب جو خوابوں کو خواب سمجھنے کے باوجود اپنی پلکوں پر سجانے کے لئے آمادہ ہے۔کیوں؟ شاید اس لئے کیونکہ اس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔اس کرب کی خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ اسے نشہ آور دوا کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ مانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کو ان خوابوں کی حیات آفرینی کے شامل ہوئے بغیر ادھوری اور نا تمام جانتے ہے۔

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکو پہ خواب جتنے ہیں

نہ کوئی خواب ، نہ کوئی خلش ، نہ کوئی خمار

یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

آنکھوں میں بھرلوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے

یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

بانسری کا کوئی نغمۂ نہ سہی چیخ سہی

ہر سکوتِ شبِ غم کوئی صدا مانگے ہے

دنیا کی کسی چھاؤں سے دھندلا نہیں سکتا

آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں جو خوابِ سحر ہم

ایسے ہی جانے کتنے اشعار ہیں جن میں زندگی کا حوصلہ موجزن ہے۔ دراصل زندگی کی مسکراہٹوں کو چن کر خوش ہو لینا اور صبح فردا کی امید سے آسودہ ہو لینا آسان ہے اور تیرہ بختی اور نامرادی پر خون کے آنسوں روکر مایوس ہو جانا بھی ان دونوں کے آمیزے کو زہر اور امرت کا مرکب سمجھ کر قبول کر لینا مشکل ہے۔ حسیاتی سطح کا تجربہ جان لیوا ہے زندگی کا کوئی سکھ دکھ کانٹوں سے خالی نہیں ان کو سمجھنا آسان ہے لیکن ان کو جھیلنا مشکل عمل ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کا نیالب ولہجہ اسی عرفان اور اسی بھگتان کا پیدا کردہ ہے۔ ان کی غزلوں نے انھیں ادب کا وہ نگینہ بنا دیا ہے جس کی روشنی آنے والوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے۔

☆

اختر الا ایمان
کی شاعری میں سماجی حسیت

سماج انسانی نظریات ، کیفیات ، اور خیالاتی تصوارت کی نمود کا باعث بنتا ہے۔ انسان اپنے اطراف واکناف میں جو کچھ دیکھتا ، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے اُسی کے تحت اُس کی ذہنی تربیت ہوتی ہے۔ گویا سماج اور انسانی حسیت کا رشتہ اتنا ہی گہرا ہے جتنا انسانی جسم کا اپنی روح سے ہوتا ہے۔ جہاں سماج انسان کو رہن سہن اور آداب ومعاشرت مہیا کرتا ہے وہیں فرد سماج میں تبدیلی کے لیے اشد ضروری ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ٹھہرتے ہیں۔

انسانی شعور پر اُس کے سماجی محرکات اور حالات کا گہرا اثر پڑھتا ہے۔ یہ اثر کبھی کبھار ہر شخص محسوس کر لیتا ہے لیکن یہ اکثر غیر محسوس طریقے سے انسانی زندگی میں

تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔سماج میں بعض ایسی شخصیات ہمیشہ رونماں ہوتی ہیں جنھیں ان سماجی تبدیلیوں کا احساس اپنے ہم نفسوں سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو کہ اپنی سوچ کے خودمختار ہوتے ہیں یا ان کا سماجی شعور ومطالعہ بے انتہا وسیع ہوتا ہے۔خصوصاً ادباوشعراء قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات اپنی ذہنی ادراکیت سے نہ صرف سماجی مسائل ومیلانات کا بخوبی علم رکھتے ہیں ساتھ ہی ان میں تبدیلیوں کی ضرورت اور مثبت ومنفی پہلوؤہات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ان شعراء وادبا کے محسوسات انھیں سماج میں پنپ رہی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کے لیے مجبور کرتے ہیں اور نتیجتاً ان لوگوں کے قلموں سے ایسی جاوِدانی تحریریں وجود میں آتی ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ایسی ہی جاودانی شاعری کا مالک شاعر اختر الایمان بھی ہے۔

اختر الایمان کی شاعری پر سماجی افکار اور ملک کی اقتصادی حالات کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔اس شاعر کے پاس سماجی حسیت جس گہرائی وگیرائی کے ساتھ پائی جاتی ہے وہ واقعی قابل مطالعہ ہے۔اختر الایمان نے اپنی زندگی میں رونماں ہونے والے کئی واقعات اور ان پر اثر انداز ہونے والے عوامل سے اپنی شاعری کو نہ صرف منور کیا بلکہ ایسے سماج کی نشاندہی بھی کی جس کی اپنی تاریخ ہے۔ان کی شاعری میں سماج اپنے افراد کے مختلف اعمال سے کیا ردّعمل ظاہر کرتا ہے اس کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ان کے پاس کئی سماجی عوامل ملکر کسی فرد کی زندگی میں تبدیلی لاتے ہیں۔اور جب یہ تبدیلیاں رونماں ہوتی ہیں تب یہ شاعر اُسکے ردّعمل سے سماج پر ہونے والے اثرات کو مرتب کرتا نظر آتا ہے۔

اختر الایمان ۱۲/نومبر بروز جمعہ ۱۹۱۵ءکو بمقام سنہی قلعہ پتھر گڑھ، نجیب آباد(یو پی) میں پیدا ہوئے۔ان کی پیدائش اپنے ننھال میں ہوئی۔وہ رہنے والے موضع بجنور کے تھے۔والد کا نام فتح محمد اور والدہ سلیمن بی تھیں۔والد پیشے سے مولوی تھے جو کبھی ایک جگہ قیام نہیں کرتے تھے۔ساری زندگی پنجاب، ہریانہ، یو پی اور اُسی کے اطراف کے علاقوں میں امامت ومعلّمی کی خاطر ہجرت کرتے رہے۔اختر الایمان کو چار بہنیں(اختری، فاطمہ، حشمت، اور رحمت) تھیں، ایک بھائی محمد یعقوب تھے ایک اور بھائی رضوان ہوئے لیکن چند ماں کے اندر انتقال کر گئے۔اختر الایمان ان تمام میں سب سے بڑے تھے۔ان کا گھرانہ انتہائی تنگ دست اور غربت کا شکار تھا۔والد معاش کی خاطر مختلف دیہی علاقوں کا سفر کیا کرتے تھے۔جس مسجد میں امامت فرماتے اُسی میں مدرسہ قائم کر لیتے اور علاقے کے بچوں کو دینی تعلیم کا درس دیا کرتے۔اختر الایمان کا بچپن انھیں کے ساتھ گزرا، یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ اختر کی ابتدائی تعلیم وتربیت والد محترم کے نگرانی میں انھیں کے مدرسہ میں ہوتی رہی۔اس سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں:

”جب ہوش آیا والد کے ساتھ اتر
پردیش ہریانہ پنجاب کے دیہاتوں
میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر
کر رہا تھا۔ والد پیشہ سے امام تھے
اور مسجدیں بدلتے رہتے تھے۔ اسی
کے ساتھ گاؤں بھی۔ میری تعلیم

کا ایک سلسلہ نہیں رہا۔ کبھی
سرکاری اسکول میں داخل کر دیا
گیا کبھی قرآن حفظ کرنے مکتب
میں بٹھا دیا گیا۔''

(رسالہ،آج کل،فروری۱۹۹۴ء۔صفحہ نمبر۔۳۱)

اُس دور کے دیہی علاقے قدرتی مناظر سے بھرے پڑے تھے۔اختر جہاں گئے وہاں انھیں گاؤں کے معصوم لوگ اور قدرتی مناظر کی شاہکاری نظر آئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس شاعر کی فطرت میں ابتداء ہی سے قدرتی مناظر سے خاص تعلق قائم ہو گیا۔یہ تعلق تاحیات اُن کے ذہن سے چمٹا رہا۔اُن کی شاعری میں اُن کے بچپن کی یادیں اور مشاہدات پوشیدہ نظر آتیں ہے۔اختر الایمان کی ننھا دماغ ان چیزوں سے بے نیاز تھا کہ ان کے یہ سفر ان کی ذہنی نشو ونما میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔یہ مشاہدات اُس وقت تک کارگر نہ تھے جب تک وہ انھیں کسی سانچے میں نہ ڈھال دیتے۔یہ موقع انھیں شاعری کے ذریعے ملا جس کا انھوں نے ہمیشہ بخوبی استعمال کیا۔اس کی بہترین مثال اُن کی نظم ''ایک لڑکا'' ہے،اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں،کبھی کھیتوں کی منڈیروں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں

سحر دم جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیروں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں ، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے ، مدرسوں سے ، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں ، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا ، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھومتا ، مڑتا
مجھے ایک لڑکا ، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے ، یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے ، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے ، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

اختر بچپن ہی سے گاؤں کے حسن اور قدرتی مناظر کے ساتھ دلی وابستگی رکھتے تھے ۔گاؤں والوں کی صحبت انکی سادگی اور خوش مزاجی و خوش طبعی نے انھیں صاف ستھرا ذہن عطا کیا۔ان کی تربیت ہندوستان کے دیہاتی ماحول میں ہوئی۔جس کی وجہ سے ان کا ذہن نہ تو عرب کے ریگزاروں میں اپنے قلب کے پھپولوں کا علاج ڈھونڈتا ہے ۔نہ ہی ایراں کی حسین وادیوں سے اپنے جسم و شعور کو

تسکین چاہتا ہے۔ یہ شاعر مکمل طور پر ہندوستانی رنگ میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی علامتیں، استعارے اور تشبیہات ملتی ہیں۔ وہ خود اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔

”میرے یہاں آپ دیکھیں کہ جو نیچر ہے وہ بدرجۂ اتم ہے۔ میں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں جو نام استعمال کیے ہیں جو پھول اور پیڑ استعمال کیے ہیں وہ ایران سے نہیں آئے ہیں وہ جامن ہے گوندنی ہے، بڑ ہے پیپل ہے، کیکر ہے، نیم ہے۔ تو یہ سب جو ہے میرا پس منظر ہے۔ یہ میرا بچپن ہے۔ ان میں میرا بچپن گذرا ہے ان کے ساتھ میں اپنی ذات کو وابستہ کرتا ہوں تو اب چونکہ مرے ساتھ جڑی ہوئی ہیں وہ ساری چیزیں جب میں اپنا اظہار کرتا ہوں تو سمبلز وہیں سے لاتا ہوں۔ علامیے وہیں سے تلاش کرتا ہوں اس لیے

کہ وہ زیادہ تر شگفتہ علامیے ہیں۔

(رسالہ آجکل، آختر الایمان نمبر، جلد نمبر ۵۲، شمارہ نمبر ۷، فروری ۱۹۹۴ء صفحہ نمبر ۵۲)

وقت اور حالات میں تبدیلی آئی اور ساتھ ہی مزاج میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ والدین کے فیصلہ کے بعد انھیں دہلی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ دہلی میں مالی معاونت نہ ہونے کے سبب انھیں یتیم خانہ (موئید السلام) جانا پڑا۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ اور یتیم خانہ کی زندگی نے اُن کے ذہن و نظریات میں ہلچل مچادی۔ اختر کی زندگی یکسر بدل گئی۔ کہاں گاؤں کی ٹھہری اور سادہ زندگی اور کہاں شہرِ دہلی کی بھیڑ بھاڑ اور رونقیں۔ اُن کی زندگی کے یہ روز مرّہ شروعاتی طور پر ان کے لیے انتہائی ہیجان بھرے رہے۔ لیکن تعلیم و تربیت اور حالات کی ستم ظریفیوں نے انھیں فوراً احساس کروادیا کہ وہ جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں حالات میں تبدیلی کوئی بڑی بات نہیں۔ اُن کے اس ذہنی انتشار سے اس شاعر کے اندر جس قسم کی متضاد شخصیت وجود میں آئی اس سے اُردو شاعری کو بے انتہاء فائدہ پہنچا ہے۔ اختر ایک طرف فطرت پسند شاعر کے طور پر اپنی ایک الگ پہچان بناتے ہیں وہیں ان کی سماجی حسیت کا لامتناہی تجربہ ان کے اندر ایک دوسری شخصیت کو وجود دیتا ہے جس کے پاس اُس کا سماج اور اُس میں بسنے والے افراد ایسے دو کردار ہیں جنکی آپسی روش نہ صرف ایکدرو سے متعلق ہیں بلکہ تضاد کا بھی شکار ہے۔ ان کی اس ہمہ جہت شخصیت نے انھیں ذاتی طور پر چاہے جو دیا ہو لیکن اُردو شاعری میں ان کو اپنا ایک الگ مقام عطا کردیا۔ اس ذہنی قلفشار پر اُن کا اپنا نظریہ قابل ذکر ہے۔

”یہ مختصر خاکہ میرے آغاز سفر

کا جسے بتا دینا اس لیے ضروری
سمجھا کہ شاعری کی تخلیقات
میں جو شخصیت کام کرتی ہے وہ
اس کی جبلی شخصیت نہیں اس
کی نفسیاتی اور بسا اوقات اس کی
اضافی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ
اضافی اور نفسیاتی شخصیت
بنتی ہے انسان کے ماحول اور
گردوپیش سے اس میں اس کی
نہاد بھی شامل ہے۔ ہے شخصیت
اپنے عمل میں بڑی ناہموار ہوتی
ہے ۔ پست اور ناگوار حالات میں
پیدا ہونے والا ضروری نہیں پست
ہمت اور قنوطی ہو۔ وہ بغاوت بھی
کر سکتا ہے اور اپنے ماحول اور
اپنی نہاد سے اور ایسا شخص بھی
ہو سکتا ہے جو تمام اخلاقی
قدروں کو فروعی ، اضافی اور لا
یعنی سمجھ کر انسان اور

انسانیت کا دشمن ہو جائے بالکل
ٹھس اور بے حس اور انسان کو
مجبور محض سمجھ کر منکسر
المزاج ہمدرد اور بہت بڑا انسان
دوست بھی۔دراصل معاملہ بڑا
الجھا ہوا ہے۔ سب ایک ٹیڑھی
لکیر ہے ۔ جہاں اپنے تجربات کی
روشنی میں انسان اپنی ذات کو
مرتب کرتا ہے وہاں ساتھ ساتھ وہ
تصورات اور خیالات بھی کام
کرتے ہیں جو اسے ورثہ میں ملے
ہیں۔ تصوارت اور خیالات ہی
نہیں تو ہمات بھی۔

(اختر الایمان: عکس اور جہتیں، مرتب۔ شاہد ماہلی، صفحہ نمبر۔ ۳۸۳)

ترقی پسند تحریک ،اور حلقہ ارباب ذوق یہ دونوں اپنے نظریات اور مقاصد کے لیے جانے جاتے ہیں۔اس تحریک اور رجحان نے اپنے دور میں تمام ہی شعراء پر گہری چھاپ چھوڑی۔ اُردو کے بیشتر شعراء کرام نے انہیں تحریکات کے تحت اپنی شاعری کی اور وقت کے گزرتے گزرتے انہیں کے ساتھ دم توڑتے چلے گئے ۔ اختر الایمان کا شمار ان چنندہ افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ تو تحریک اور نہ ہی رجحان

کو پوری طرح قبول کیا نہ ہی ٹھکرایا بلکہ اپنی ایک ایسی معیانہ روش قائم کی جسے بعد کے آنے والوں نے نہ صرف بے حد پسند کیا بلکہ اپنے لیے مشعل راہ جانا۔ اختر الایمان کی حیات ہی میں انھیں اس معیانہ روی کے عوض نہ صرف بلندی وسرخروی حاصل ہوئی بلکہ اپنے زمانے کا بہترین شاعر بھی کہا گیا۔ لیکن اس شاعر کے جھولے میں اب بھی بہت کچھ تھا۔ انہوں نے اتنی شہرت وعزت کے باوجود اپنی روش میں تبدیلی نہ آنے دی۔

اختر کی شاعری میں سماجی حسیت کا عنصر بہت نمایا ہے۔ انھوں نے اپنے دور کی عام روش سے ہٹ کر اپنے سماج کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ نہ تو شدت پسندی کے قائل تھے اور نہ ہی آنکھ موندھے بیٹھے رہنے کے۔ ان کی حسیت حقیقی سماج کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر انھیں اقدار کا شاعر بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے دور کے ایسے شاعر ہیں جن کے پاس سماجی حسیت کا آئینہ دیگر شعراء سے زیادہ صاف اور اعتدال پر ہے۔ ان کے کلامی مجموعے میں ایسی کئی نظمیں موجود ہیں جو اقدار و سماجی حسیت کی بہترین مثالیں ہیں۔ جن میں ''مسجد، موت، پرانی فصیل، قلوپطرہ'' قابل ذکر ہیں۔ اختر اور دیگر شعراء کے کلام میں ایک بڑا واضح فرق یہ ملتا ہے کہ وہ سماجی حسیت کے متعلق اقدار کو اپنا اظہار خیال بناتے ہیں جبکہ دیگر شعراء مادی قدروں یا معاشی افکار کے تئیں اپنی شاعری کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔

سماج میں کسی فرد کا وجود میں آنا کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب وہ اپنے سماج کے اُن اقدار کی پاسداری رکھتے ہوئے بچپن اور پھر جوانی میں قدم رکھتا ہے اور زمانے کی بھاگ دوڑ میں اپنی اقداری کیفیات کو مسخ کرتا ہوا معاشی اور ذہنی تنگی

کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے اس کا مشاہدہ ہمیں اختر الایمان کے یہاں بہت عمدگی سے ملتا ہے۔ یہ اس شاعر کی سب سے بڑی اور انفرادی خوبی ہے۔ اقدار کی زوالی، سماج میں تبدیلی، اور انسان پر ہونے والے اس کے مضمرات سبھی کچھ ان کے پاس موجود ہے۔ اس طرح کا سماجی مشاہدہ کسی دوسرے شاعر کے پاس کم نظر آیا ہے۔ نظم ''مسجد'' کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

دور برگد کی گھنی چھاؤں میں خاموش وملول
جس جگہ رات کے تاریک کدن کے نیچے
ماضی و حال گنہگار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے
ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے
گر د آلود چراغوں کے ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں

ان اشعار میں جہاں ایک طرف ہندوستانی معاشرے کی تہذیب وتمدن کی عکاسی موجود ہے وہیں علامتی طور پر بہتی ندی کا ذکر وقت کے گزرتے لمحات کی طرف

اشارہ کرتا ہے۔اختر الایمان وقت کے گزرتے لمحات کے ساتھ سماج میں رونما ہوتی تبدیلیوں کا ذکر بڑی شدت کرتے ہیں۔ان کے پاس وقت، خدا کے بعد سب سے بڑی طاقت بن کرابھرتا ہے۔وہ خود بیان کرتے ہیں۔

"یہ ایک ایسی زندہ و پائندہ ذات
ہے جو "اننت" ہے جو اگر وقت نہ
ہوتی تو خدا سے بڑی چیز ہوتی
اس لیے کہ اس کے ہاتھوں خدا کی
شکل و صورت اور تصور بھی
بدلتا رہتا ہے۔"

(اختر الایمان: بنت لمحات۔پیش لفظ)

انھوں نے قدیم مسجد کی بوسیدگی سے سماجی حسیت کو اخذ کیا ہے جس کے وجود میں آنے سے لیکراس کے عروج کا زمانہ اور پھر سماجی اقدار کی تبدیلیوں سے اس کے زوال کو پیش کیا ہے۔ایک مسجد جو کبھی واقعی انسانی نفوس کے لیے قابل احترام اور عبادت کا مقام رکھا کرتی تھی آج شکستہ حالت میں اور ٹوٹی پھوٹی نظر آتی ہے یہ صرف ایک عمارت نہیں بلکہ اس میں تہذیب اور قوم کی تاریخ پوشیدہ ہے۔اس کا کلس اپنی شکستگی کے ذریعے بہت کچھ بتا رہا ہے۔گیت گا رہا ہے اپنے اقدار کی پامالی کا منظر دکھا رہا ہے۔اس مسجد میں جو گرد میں لپٹے ہوئے چراغ ہیں جن میں کبھی روشنی ہوا کرتی تھی ،اور کسی زمانے میں اس روشنی سے مسجد کو منور کیا جاتا تھا آج ان پر دھول کی تہیں جمی پڑی ہیں۔ ہر روز غروب ہوتا سورج اس مسجد کے دریچوں سے وداع لیتا ہوا اس امید

میں ہے کہ شاید یہاں کچھ تبدیلی رونما ہو جائے۔اس مسجد کی یہ حالت کچھ اور نہیں بس انسانی اقدار کی پامالی اور انسانی حسیت کی ناپائیداری ہے۔اس تبدیلی کا باعث ان کے پاس کچھ اور نہیں انسانی احساس ہے جس کی کمی اور زوال کے سبب عبادت گاہیں جو کہ کسی زمانے میں تعلیم وتربیت کی بہترین آماجگاہ تھی اب ویران ہیں۔یہ ویرانی بھی اتنی ویرانی ہے کہ برسوں سے اس کے قرب وجوار سے گزرنے کے باوجود کسی کو اس کا خیال نہیں آتا۔اس کی بوسیدگی کا عالم یہ ہے کہ مسافر ابابیلیں اب یہاں اپنی کمیں گاہیں بنا چکی ہیں۔

یا ابابیل کوئی آمدِ سرما کے قریب
اس کو مسکن کے لیے ڈھونڈ لیا کرتی ہے
اور محرابِ شکستہ میں سمٹ کر پہروں
داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے

اپنی شاعری میں وہ ایسی روش اختیار کرتے ہیں جس میں معیانہ روی کے ساتھ ساتھ ایسی شعریت موجود ہے جس کی ادب وقاری دونوں کو ضرورت تھی۔ان کا اضمحلال بھی دیگر شعراء کے مقابلے میں حقیقی اور کم رقت آمیز ہے۔ان کی افسردگی سچائی پر مبنی ہے۔جذبات سے عاری نہیں لیکن انتشاریت کا شکار بھی نہیں۔وہ انسانی نفسیات کو اُکساتے ہوئے بھی بے حد محتاط نظر آتے ہیں۔ملاحظہ کیجئے۔

چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دُھلی چادر اپنی

جس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ پس اک

چشمِ نم کرتی ہے شبنم یہاں، اکثر اپنی

جب مایوسی کی چادر مکمل طور پر انسانی فطرت محیط ہوجاتی ہے اختر روشنی ڈھونڈ لاتے ہیں۔ملاحظہ کیجئے کہ کیسے ایک ویران اور شکستہ مقام سے ایک دیے کی شکل میں اُمید کی کرن دکھائی دیتی ہے اور اقدار و سماجی احساس کو دوبارہ وجود ملتا ہے۔

ایک میلا سا، اکیلا سا ، فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھاتے بھی نہیں
اک جلتا ہے مگر اک بجھا کرتا ہے

ان اشعار میں بے شک سماجی بے حسی کی تصویر کھینچی گئی ہے لیکن مایوسی کے بجائے روشنی کی کرن کو ابھارا گیا ہے۔بقول شاعر رعشہ زدہ ہاتھوں کی آخر کتنی آزمائش ہوگی اب تو نئی پود کو آگے آنا چاہیے اور اپنی ذمہ داریوں سے انہیں آگاہی ہونی چاہیے۔اگر اس سماج کے بوڑھے اور تجربہ کار لوگ اپنے بعد آنے والوں کی تربیت نہیں کرینگے تو وقت کا دھارا اُس مسجد کی مانند اس بوسیدہ اور دیمک لگی قوم کو مکمل طور پر ڈھا دیگا، ہلاک کر دیگا۔اس روشنی کی کرن میں امید مقدم ہے۔

آ چکے صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام
کوہ و دراب نہ سنیں گے وہ صدائے جبرئیل
اب کسی کعبے کی شاید نہ پڑے گی بنیاد
کھو گئی دشت فراموشی میں آوازِ خلیل

روحانیت اور روحانی اقدار کے ختم ہونے کا احساس ان اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔اُمید کا وجود باقی رہتا ہے۔وہ روشنی جو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی ہے وہ اس کے لیے جدوجہد کے خواہاں ہیں۔اختر سماجی درندگی اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کا سبب مذہب و روحانیت سے دوری کو مانتے ہیں ۔اُن کے نظریہ کے مطابق اگر دوبارہ جبرئیلؑ کی مدد اور خلیل کی سی ذات پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے اقدار کی بقاء انتہائی لازم عمل بن جاتا ہے۔

اپنے دوسرے اشعار میں ندی کے بہتے پانی سے وقت کو تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وقت کسی کے لیے نہیں تھمتا اگر ہم اپنی اصلاح خود نہ کریں اور گر یہ سماج یوں ہی اقدار کی پامالی کرتا رہیگا تب ایک دن یہ سب کچھ ختم ہو جائیگا۔ ہمارا وجود اس جہاں میں باقی ہی نہ رہیگا۔

تیز ندی کی ہر ایک موج تلاطم بر دوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

یہ اشعار اپنے دور کے اقدار اور سماجی حسیت کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔اس نظم میں علامت نگاری کو بہترین طور پر استعمال کیا گیا ہے اس خوبی نے اس نظم میں نہ صرف حسن پیدا کیا ہے بلکہ قاری کے ذہن میں کئی سوالات بھی ابھارے ہیں جو کہ اپنی تہذیب وتمدن کے زوال سے متعلق ہیں۔ایک قوم جس کا سب کچھ اُس کے مذہب سے وابستہ ہے اُس کا یوں بوسیدہ حال ہونا اور یوں وقت اور حالات کے

سامنے بکھر جانا یقیناً دلبر داشتہ کر دیتا ہے۔اس پر دنیا سے اس قوم کا نشاں مٹایا جانا اور اس کا احساس ہوتے ہوئے بھی اس قوم کی بے حسی اور لاچارگی کو مسجد کی بوسیدگی سے تشبیہہ دی گئی ہے۔یہ عمل قابل ستائش ہے۔بوسیدہ مسجد جو کہ پہلے ہی اپنی خوبیوں اور رعنائیوں کو کھو چکی ہے اب اپنے وجود کی بقاء کے لیے جدوجہد کرنے کو بھی تیار نہیں۔اس نظم کا مرکزی احساس بھی یہی ہے۔

نظم ''موت'' بھی اقدار اور اس کی حسّی اور پامالی پر مبنی ہے۔مسجد اور اس نظم کا موضوع تقریباً یکساں نظر آتا ہے لیکن علامتوں میں بڑی حد تک تبدیلی ملتی ہے۔نظم مسجد میں پانی سے وقت کو تشبیہہ دی گئی تھی۔جبکہ یہاں ڈرامائی انداز کو'دستک'' کے ذریعہ پیدا کیا گیا ہے۔اس نظم میں ڈرامائی کیفیت پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔اختر الایمان نے''آب جو'' کے دیباچے میں اس نظم کے علامتی پہلوؤں پر اپنے نظریات قلم بند کیے ہیں۔

''اور موت ایک چھوٹا سا منظوم
ڈرامہ ہے ۔ جس میں تین کردار
مرد،عورت،اوردستک ۔مرد بیمار
ہے اور بستر مرگ ہے اور نزع کے
عالم میں ہے عور اس کی محبوبہ
ہے اور مرد کے ذہن کو موت کے اس
خیال سے باز رکھنا چاہتی ہے جو
اس پر حاوی اور مسلط ہو گیا ہے

اور دستک ایک ایسی آواز ہے جو
مسلسل دروازے پر سنائی دے
رہی ہے----''موت'' میں بھی جو
آدمی بستر مرگ پر ہے وہ ان
پرانی قدروں کا علامیہ ہے جو اب
مر رہی ہیں۔ محبوبہ جھوٹی
تسلیاں ہے اور مسلسل دستک
وقت کی وہ آواز ہے جو کبھی بند
نہیں ہوتی ہمیشہ زندگی کے
دروازے کو کھٹکھٹاتی رہتی ہے
اور مکین اگر اس آواز کو نہیں
سنتا تو وہ اس مکان کو توڑ ڈالتی
ہے اور اس کی جگہ نیا مکان
تعمیر کر ڈالتی ہے۔''

(بحوالہ:کلیات اختر الایمان:شاعر:اختر الایمان،صفحہ نمبر:۲۰)

نظم کا ڈرامائی انداز اس کی جان ہے۔جس انداز سے انسانی موت کو ختم ہوتی اقدار کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے وہ لاجواب ہے۔اس نظم کی ابتدائی اشعار میں ایک مرد کو پیش کیا گیا ہے جو علامت ہے بہادری اور طاقت کی لیکن افسوس کہ اس مرد کے پاس اب کمزوری کا بسیرا ہے یہ اپنے قویٰ شل کر چکا اور بیماری (اقدار کی

پامالی) نے اسے موت کے قریب کر دیا ہے۔

۱)

''کون'' آوارہ ہواؤں کا سبکسار ہجوم؟
آہ احساس کی زنجیر گراں ٹوٹ گئی

۲)

اور سرمایۂ انفساس پریشاں نہ رہا
میرے سینے میں الجھنے لگی فریاش میری
زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
ٹمٹاتا ہے مرے ساتھ نگاہوں کا چراغ

نظم کی شروعات ایک مرد کے ضعف و بیماری سے ہوتی ہے، اسی ضعف و کمزوری میں اُسے ایک دستک سنائی دیتی ہے۔ یہ دستک کچھ اور نہیں موت ہے۔ ختم ہوتی زندگانی کی علامت ہے۔ اس مرد کو آج اپنی زندگی، اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اب اس کے ہاتھ سوائے افسوس و شرمندگی کے کچھ اور نہیں۔ اُس نے جس محبوبہ اور جن معشوقوں کے بیچ زندگی برباد کی ہے آج اُن کے دلاسے بھی کارگر نہیں رہے۔ جس طرح صحت اور نشاط کے وقت اس مرد کو دلاسے دے کر اُسے گمراہ کیا گیا تھا آج قریب المرگ بھی اس کے اطراف یہی عالم ہے لیکن آج اسے احساس ہو چلا ہے کہ یہ دلاسے کچھ اور نہیں بس سراب ہیں۔ اس مرنے والے کو جو دستک سنائی دے رہی ہے، وہی آج سب پر غالب ہے۔ آج زندگانی ختم ہونی ہے آج اس نشاط و سرور

کی مجلس کا خاتمہ ہے اس عروج کو زوال ہے۔ شاعر کہتا ہے آج اس دستک سے نجات نہیں، اس کا توڑ میرے پاس کچھ نہیں۔ آج کسی محبوبہ دلفریب کے دلاسے کام نہیں آنے کے کیونکہ مجھے میرے اجداد کی روحیں نظر آ رہی ہیں، ایک تاریک دھواں میرے گرد چھاتا جا رہا ہے، اور میری زندگی کا دیا اس دھویں میں مدھم سا ٹمٹماتا کہیں ضم ہونے کو ہے۔ آج میری سانسوں کی زنجیر ٹوٹنے والی ہے، لیکن افسوس صد افسوس کہ آج کسی کا سہارا میسر نہیں، آج میری فریاد سننے یا سنانے والا کوئی نہیں۔ آج میرے گھر موت آئی ہے جس کی دستک کا انداز گویا ایسا ہے جیسے وہ ان در و دیواروں کو مسمار کر کے مجھ تک پہنچے گی۔ یہ شخص اپنے حالات، ستم ظریفی، کسم پرسی اور بے چارگی میں دم توڑنے والا ہے۔ اور یہ سب کچھ زمانے کے چلن میں رنگ جانے کے باعث ہوا۔

اس قدر ہوش سے بیگانہ ہوئے جاتے ہو
تم چلی جاؤ یہ دیوار پہ کیا ہے رقصاں
میرے اجداد کی بھٹکی ہوئی روحیں تو نہیں ؟
پھر نگاہوں پہ امنڈ آیا ہے تاریک دھواں
ٹمٹماتا ہے میرے ساتھ یہ مایوس چراغ
آج ملتا نہیں افسوس پتنگوں کا نشاں
میرے سینے میں الجھنے لگی فریاد میری
ٹوٹنے والی ہے الفاظ کی زنجیرِ گراں
توڑ ڈالیں گا کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

اس نظم میں ڈرامائیت بھر پور ہے ساتھ ہی اُس دور کے اقدار اور سماجی حسیت پر طنز بھی کیا گیا ہے جو اُس دور کی زوال پذیر تہذیب وتمدن کا آئینہ ہے۔ وہ مرد جس کی قوت اور طاقت نے اُسے دلاسوں اور نشاط انگیزی میں مبتلا کر رکھا تھا اب آخری وقت میں اس کے آنکھوں میں نمی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوں امڈ امڈ آتے ہیں جو اُس کی پلکو سے گرتے چلے جا رہے ہیں ۔ یہ قطرے اسکی افسردگی اور شرمندگی ہے۔ لیکن اب ان آنسوؤں کا کوئی مول نہیں۔ اب ان محسوسات کی کوئی اہمیت نہیں۔ وجہ موت کی دی جانے والی دستک ہے۔ اب اُس مرد یا جسے ہم تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں اس کے پاس کوئی ایسا راستہ نہیں جس سے وہ ماضی کو بدل سکے۔ وہ بھی اپنے اقدار کی طرح کہیں کھو جانے کو ہے۔ اُسے کوئی یاد نہیں رکھنے والا۔ جس طرح اس نے اپنے اسلاف کی قربانیوں کو بھلا کر زندگی گزاری تھی اب وہ بھی انھیں کی طرح ایک یاد بن کر کھو جائے گا۔

اُف یہ مغموم فضاؤں کا سکوت
میرے سینے میں جاتی ہے آواز مری
تیرگی، اُف یہ دھندلکا ، مرے نزدیک نہ آ
یہ مرے ہاتھ پہ جلتی ہوئی کیا چیز گری؟
آج اس اشک ندامت کا کوئی مول نہیں
آہ احساس کی زنجیر گراں ٹوٹ گئی
اور یہ میری محبت بھی تجھے جو ہے عزیز
کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی

اختر الایمان کی ایک اور اہم نظم ''پرانی فصیل'' ہے۔ نظم میں ان کے ابتدائی شاعری کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ یہ نظم ابتداء میں متاثر کن اور جذباتی نظر آتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں جذباتیت کا دامن شاعر کے ہاتھ سے چھوٹتا چلا گیا۔ اس نظم میں پرانی تہذیب ، ماضی کے گزرے حالات سے لیکر اپنے دور کی سماجی قدروں کی ٹوٹتی ، بکھرتی تصویروں کو انتہائی دل گرفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ سماجی اقدار کی پامالی اور اس کے وجوہات کا ذکر شاعر نے پرانی فصیل سے اعلامیہ طور پر کیا ۔ یہ فصیل اپنے اندر اقدار، حالات، وقت، سماجی عکاسی ، فردی غیر ذمہ داریاں سبھی کچھ سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس فصیل کی نظر سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ اس فصیل نے صدیوں کے بہیمانہ طلسم کو دیکھا ہے۔ سماج کے بکھرتے اور اُجڑتے حالات کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ شاعر پرانی فصیل کی یادوں کے ذریعے ایسی باتیں پیش کرتا ہے جس سے ماضی اور حال کے فرق کو سمجھا جا سکے ۔ وہ کہتا ہے کہ میں جو کہ ایک فصیل ہوں آج ایسی شئے ہوں جو پرانی قدروں کی امین اور قدیم اقدار کی پاسبان بن کر بوسیدہ حال کھڑی ہے۔ میری خستہ حالی تاریک راتوں کی مانند ہے۔ جس میں سوائے اندھیرے اور سوگواری کے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ میں ایسی شئے بن چکی ہوں جس کے دراڑوں اور رخنوں کی بوسیدگی میں مجھ پر گزرنے والے وقت اور حالات کا المیہ لکھا ہوا ہے۔ میں ماضی کی شاندار یاد ہوں میں قدیم اقدار کی بہترین عکاس ہوں میں اپنی قدامت اور حال کی بہترین مثال ہوں۔ میں بیک وقت نہ صرف ماضی کی یاد تازہ کرتی ہوں بلکہ حال کی المناکیوں کی عکاسی بھی کرتی ہوں۔ زمانہ گزرتا جاتا ہے ساتھ ہی اپنا اقدار اور سماجی تبدیلیوں کو بھی بدل لیتا ہے لیکن میں اُسی مقام اور اُسی جگہ آج بھی ویسی ہی کھڑی ہوں۔

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں اُلجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رُک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن

ان کے پاس اقدار کی پامالی سماج اور فرد کی پامالی ہے۔ فرد سماج کا حصہ اور سماج اقدار کا حصہ بن کر ان کی شاعری میں اُبھرتے ہیں۔ یہ نظم تہذیبی اقدار کی پامالی اور سماجی حسیت کی کوتاہیوں کا شاخسانہ ہے۔ اس نظم میں اختر الایمان نے سامی قدروں کی شکست وریخت کو پیش کیا ہے۔ یہ نظم سماج کے کئی تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ نظم کا المیہ یہ ہے کہ اس کے ابتدائی سات بند انتہائی متاثر کن اور لمحہ فکریہ سے معمور ہیں لیکن اس کے بعد اس نظم کی فکر وحسیت کہیں کھو جاتی ہے۔ جس کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ابتدائی اشعار انتہائی جامع اور معنیٰ خیز ہیں جو اپنی تہذیب اور اقدار کی نمایاں عکاسی کے لیے کافی محسوس ہوتے ہیں۔ اس نظم کا مزید مطالعہ اختر کی ذہنی فکر کا اظہار ہے جس میں سماج کی بے حسی اور ناپائیداری کی بہترین مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمع امید و تمنا لو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت، کوئی کروٹ نہیں لیتی

نظم میں بے حسی اور کم مائیگی کو قلبی طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس فصیل کی

ویرانی کچھ اور نہیں تہذیب اور تمدن کی مٹتی قدریں ہیں جن کا احساس نئی پود کو بالکل نہیں رہا۔ وہ اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتے لیکن شاعر ان کی بے حسی اور بے بسی دونوں پر افسردہ نظر آتا ہے۔ قوم کی کسم پرسی ان کی زبوں حالی اور بدقسمتی کا ماتم کرتا ہے۔ اس فصیل کی زبان کے ذریعے جن سرگوشیوں کو بیان کیا گیا ہے یہ سرگوشیاں اپنے اقدار اور تمدن کی بہترین عکاس ہیں۔ شاعر افسردہ ہے کہ کسی میں اتنی قوت نہیں کہ وہ اپنی تہذیب کی بقاء کے لیے آواز بھی اُٹھائے، کوئی نظر نہیں آتا جس کا سہارا اس قوم کے احساس کو اس کی فکر کو دوبارہ جگا سکے۔

اختر الایمان فصیل کی تاریخ کو رقم کرتے ہوئے ملک وسماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انکے اشعار میں ملک کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ وہ اُس سماج کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی حسیت کہی گُم ہے۔ جس کے پاس احساس اور جنون کی کمی ہے جو اپنی تاریخ، اپنے اسلاف سے کچھ نہیں سیکھتا، بلکہ افسوس اور افسردگی اور شکایات کا شیوہ اپناتا ہے، اس قوم کے بازوؤں میں طاقت ہے لیکن جوش و جولانی نہیں۔ اس فصیل کے پاس اب محض چند بھٹکتی ارواحیں ہیں جو اقدار کے پرستاروں کی ہیں اس زندہ نما مردہ سماج کے لیے سر جوڑتی ہیں یہ وہ پُرکھے ہیں جنھوں نے اس قوم کو اپنی حفاظت کرنا سکھایا تھا لیکن افسوس یہ قوم اسے فصیل کے نیچے کہیں دفن کر چکیں ہے۔ یہ فصیل جسے سماج سے تشبیہہ دی گئی ہے یہ کبھی اس شہر کی حفاظت کیا کرتی تھی لیکن آج اس میں سڑن، کائی، کمزوری اور بوسیدگی سبھی کچھ موجود ہے۔

یہاں اسرار ہیں سرگوشیاں ہیں بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر بازوں ہواؤں کے

یہاں بھٹکی ہوئی روحیں کبھی سر جوڑ لیتی ہیں
یہاں پر دفن ہے گزری ہوئی تہذیب کے نقشے

ساتویں بند میں شاعر نے انتہائے شدّت اختیار کیں ہے۔ یہ بند احساس و شعور کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ اس بند میں پرانی فصیل ایک ایسی شکل اختیار کر لیتی ہیں جو بڑی وضاحت کے ساتھ اُس دور کے سماج اور اپنے قوم کے اقدار کی نمایاں عکاسی کر سکے۔ شاعر پر اسرار فضاء کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ یہی اس نظم کا نکتہ عروج بھی ہے۔ ان اشعار میں اختر اُس قوم کے خلاف الم اٹھاتے ہیں جس نے اس ملک میں قتل و غارت گیری کا بازار عام کر رکھا تھا، جس نے انسانی جذباتوں کو، یہاں کی تہذیب کو مسمار کیا ہے۔ اُن بادشاہوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی کبھی حکومتیں تھیں۔ جنھوں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا اپنے جذباتوں اور محبتوں کو اس قوم پر نچھاور کیا جو ان کی زندگی اور حکومت کی پونجی تھی لیکن ان قوم پرست حکمرانوں کے خلاف سازشیں کر کے انھیں زمانے میں رسوا کر دیا گیا انھیں لوٹ لیا گیا۔ ان بادشاہوں جن کی ٹوپیاں ترچھی تھی (مراد، مغل حکمراں) یہ وہ مظلوم ہیں جن کی حالت بالکل اس ٹوٹی فصیل کی مانند ہو کر رہ گئی ہے۔

مری نظروں نے قتل و خوں، ہوس رانی بھی دیکھی ہے
یہاں جذبات بھی عریاں کیے ہیں کج کلاہوں نے
یہاں لوٹی ہوئی پونجی پر ماتم بھی کیا آ کر
یہاں تھک کر سہارا بھی لیا ہے بادشاہوں نے

اس نظم میں انسانی سماج اور اس میں پنپ رہی برائیوں، اقدار کی پامالی،

حسیت کا دھندلا نہ سبھی کچھ براہِ راست پیش کیا گیا ہے۔ ساتویں بند کے بعد اس نظم کی فضاء کسی قدر خشک ہو جاتی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں لیکن آخری بند میں اس نظم میں دوبارہ جان لوٹتی محسوس ہوتیں ہے۔ یہ نظم شاعر کے نظام فکر کی بہترین عکاس ہیں، ساتھ ہی اپنے عہد، سماج، بھوک، غربت، حالات، بے چارگی، بے بسی، اخلاقی و اقداری زوال، سماجی انتشار، اور دھندلاتے سماجی احساس کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہیں۔ نظم کے آخری اشعار اپنے مقصد کو پورہ کرتے ہوئے اُس احساس کو جگانے کا کام کرتے ہیں جس کا تعلق سماجی اقدار اور انسانی حسیت سے تعلق قائم کیے ہوئے ہیں۔

غرض اک دور آتا ہے کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
میرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہے
نہ توشہ ہوں، نہ راہی ہوں، نہ منزل ہوں، نہ جادہ ہوں!

☆

مضامین
متعلق نثر

مولانا ابوالکلام آزاد اور تقسیم ہند

"ملک آزاد تھا، لیکن اس سے
پہلے کہ لوگ آزادی اور فتح کے
احساس کا پورا لطف اٹھا سکیں،
انھوں نے بیدار ہوتے ہی یہ دیکھا
کہ آزادی کا ہمرکاب ایک عظیم
المیہ بھی ہے۔ ہم نے یہ بھی

سمجھ لیا کہ آزادی کی نعمتوں
سے محفوظ ہونے اور دم لینے سے
پہلے ہمیں ایک طویل اور دشوار
سفر طے کرنا ہوگا۔"

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف:مولانا ابوالکلام آزاد۔صفحہ نمبر:۲۸۶)

۱۹۴۷ء ملک ہند کی آزادی کا سال رہا۔یہ آزادی تمام ہندوستانیوں کی اُس جدوجہد کا پھل تھی جس کے لیے ۱۸۵۷ء سے مستقل کوششیں کی گئیں تھی اور پوری ایک صدی لگ گئی اسے حاصل کرنے میں۔اس آزادی کے لیے ملک نے بہت سی قربانیاں دی۔ بہت خون بہا،نتیجہ ملک کی آزادی رہا۔لیکن افسوس یہ آزادی ایک نامکمل اور جانبدار نتیجہ کے ساتھ تاریخ میں رقم ہے۔اس آزادی کے دو فریق نکلے ایک مسلمان اور دوسرا ہندو۔ان دونوں نے آپسی رنجشوں اور شاخسانوں کو بھلا کر اس ملک کو آزاد تو کرا لیا لیکن ملک حاصل ہوتے ہی سیاست کا وہ ننگا ناچ ہوا جس نے ملک کو تقسم کر کے رکھدیا۔یہ المیہ جسے ہم آج تقسیم ہند کے نام سے یاد کرتے ہیں ۱۹۴۷ء سے قبل کے بعض ایسے فیصلوں کا نتیجہ ہے جس میں دونوں فریق کے سیاستداں ذمہ دار ہیں۔تقسیم ہند نہ تو مسلمانوں کی خواہش تھی اور نہ ہی ہندوؤں کا بڑا طبقہ اسے قبول کرنا چاہتا تھا۔ چند سیاسی رہنماؤں نے اپنے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے کچھ ایسے شخصیات کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا جن کی خواہش ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی تھی،نہ کہ آپس میں لڑ مرنے کی۔لیکن تاریخ گواہ ہے بہکانے والے ہمیشہ شریف النفس بنے رہے اور بھکنے والے بھکتے چلے

گئے۔نتیجہ کیا نکلا؟ یہی ناں کہ کائنات کا ایک بہترین گوشہ جسے ساری دنیا میں اقوت، یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی مثال بن کر پیش ہونا تھا وہ اپنے غیر ضروری سیاسی و مذہبی منافرت میں اُلجھ کر تقسیم ہوگیا۔

ہندوستان ایک ایسی تہذیب اور نظریات کا مسکن رہا ہے جس نے مختلف قوموں اور مذاہب کو اپنے اندر نہ صرف سمو لیا بلکہ ایک ایسی آمزش کے ساتھ سمویا کہ اب ان قوموں، مذاہب اور تہذیبوں کو الگ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بات ہے۔نظریاتی اختلافات ہندوستان میں ہمیشہ ہی رہے مگر اس کے مضر اثرات کسی زمانے میں اتنے قوی نہ تھے کہ چھوٹی چھوٹی بات پر آپس میں خونریزیاں ہوجائے۔انگریزوں کی آمد اور اُن کی حکومت کے خاتمے پر انہیں ملک بدر کیے جانے کے بعد انھوں نے اس خطے میں ایک ایسے ناسوری زخم کا بیج بویا جس کی کاشت روز بہ روز نہ صرف پھل پھول رہیں ہے بلکہ اپنے ساتھ چند ایسی بیماریوں کو بھی لے آئیں ہے جس نے ملک میں بسے ہر شخص کو متاثر کیا ہے۔اس ملک کی حالت یہ ہو چلی ہے کہ اپنے حق کی مانگ تو دور اب تو لب کشائی کی اجازت بھی نہ رہی۔ان مسائل کی جڑ کچھ اور نہیں تقسیم ہند ہے۔اس تقسم کی کہانی مولانا آزاد کی تحرروں سے بہت وضاحت کے ساتھ سمجھ آتی ہے۔وہ ایک سیاسی رہنماں تھے اور جتنی قریب سے انھوں نے ملک کی بدلتی صورت کو دیکھا ہے کوئی اور شاید ہی دیکھ سکا ہو۔بقول مولانا آزاد۔

"یہاں فطری طور پر ایک سوال
اٹھتا ہے۔اگر تمام ہندوستانیوں
کے دلوں میں تقسیم نے غصے اور

افسوس کہ ایسے احساسات پیدا
کیے تو ہندوستان کی عوام نے اسے
مانا کیوں نہیں؟ اس کی اور زیادہ
مخالفت کیوں نہیں ہوئی؟ ایک
ایسا فیصلہ کرنے میں اتنی جلد
بازی کیوں ہوئی جسے تقریباً ہر
شخص غلط تصور کرتا تھا۔''

(بحوالہ:۔ ہماری آزادی۔ مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد۔ صفحہ نمبر: ۲۸۸)

تقسیم ہند کوئی ایسا سانحہ نہیں جس کے اثرات وقتی رہے۔ یہ ایک دائمی مرض بن کر اس خطّے سے جُڑ گیا چکا ہے۔ یہ مرض جس کا زخم دونوں ہی جانب یکساں ہے اپنا ایک تاریخی تناظر رکھتا ہے۔ ہم تمام اسے جانتے ضرور ہیں۔ لیکن بات جب ماننے کی آتی ہے تب نظریات یکسر دہرا راستہ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں فریق آج بھی ۱۹۴۷ء کی طرح آمنے سامنے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مرض کا علاج اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس حقیقی اور غیر جانب دارانہ فیصلے کو دونوں خطّے والے متفقہ طور قبول نہ کرلیں کہ یہ المیہ ہو چکا۔

تقسیم ہند جتنا علاقائی مسئلہ نہیں رہا اُس سے کہیں زیادہ مذہبی اور ذاتی انا کا مسئلہ بن چکا ہے۔ اس کا حل تلاش کیا جانا چاہیے۔ آج کی پیڑی کو اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے سیاسی رہنماؤں کے دم پر ہندوستان کے ایک علاقے پر قابض ہوئے اور اسلامی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ آج تلک

یہ لوگ اپنے علاقے سے اس ملک (ہند) میں شر پھیلا رہے ہیں۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی تو یہ بات قابلِ قبول تھی لیکن اسی کے ساتھ اضافاً اس بات کا ذکر کہ اُن خطّے والوں کی مدد یہاں کا مسلمان بڑی دلدہی سے کرتا ہے نا قابلِ برداشت ہے۔ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ تقسیم کے بعد جن مسلمانوں نے اپنے وطن ہندوستان کو چھوڑ کر نہ جانے کا فیصلہ کیا وہ ملک کے حقیقی اور سچے پرستار اور مادرِ وطن کے چاہنے والے ہندوستانی ہیں۔ اس کی وضاحت ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی تاریخ میں پوشیدہ ہے جس کا ذکر آج کے دور میں ضروری عمل قرار پاتا ہے۔ اُس تاریخ کا مطالعہ ہونا چاہیے جس میں جہاں ایک طرف گاندھی جیسے شخص کی جدوجہد موجود تھی تو دوسری طرف ابوالکلام آزاد جیسے سیاسی راہنما کی کوششیں جو تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے۔

تقسیم ایک المیہ ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں۔ جو کچھ ہوا اُسے نہیں ہونا چاہیے تھا یہ بھی ایک مستحکم حقیقت ہے۔ لیکن جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تقسیم ہمیں کیا سکھاتی ہے؟ اور اس کی اصل تاریخ کیا ہے۔ کیا یہ ایک سیاسی سازش تھی؟ یا مذہبی جھگڑا تھا جو اتنا بڑھ گیا کہ اس نے ملک کو تقسیم کر ڈالا؟ یا یہ چند ایسے لوگوں کی ذہنی کدورت تھی جس نے چند معصوم اور بے گناہ لوگوں کو مہرا بنا کر اپنی قلبی وابدی دشمنیوں کا بدلہ لیا۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی لکھی ہوئی تحریریں بے حد معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف ایک چشم دید گواہ تھے بلکہ وہ ایک ایسے سیاسی رہنماں تھے جس نے تمام ملکی حالات کو اس طرح دیکھا، سمجھا اور جانا تھا جیسا کوئی اور نہ کر پایا۔ اس کی وجہ اُن کی سیاسی اور علمی حیثیت تھی۔

مولانا ابوالکلام اور محمد علی جناح یہ دو ایسے نام ہیں جو مسلمانوں کے سیاسی راہنما کے طور پر تاریخ میں رقم ہیں۔ ایک نے ملک کو تقسیم کیا اور دوسرے نے ملک کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیا۔ وہ بھی بغیر یہ جانے کہ اُس کا صلہ ملیگا بھی کہ نہیں؟۔ بے غرض، اپنے ملک کے لیے جدوجہد کرنے والے اس سیاستداں نے ملک کو نہ صرف دو حصّوں میں بٹتے دیکھا بلکہ صدیوں کی اُس گنگا جمنی تہذیب کو بھی تقسیم ہوتے دیکھا جو کہ پورے عالم کے لیے مشعل راہ بن چلی تھی۔ تقسیم سے متعلق اُس دور میں جو عوامی نظریات تھے وہ اوپر کے اقتباس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے جملوں میں موجود ہیں۔ یہ بات انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھدی کہ تقسیم سے نہ تو ہندو خوش تھے اور نہ مسلم۔ پھر اسے کیا سمجھا جائے؟ میری کم مایہ نظریہ سمجھتی ہے کہ یہ ایک سیاسی ہتھکنڈا تھا جس کی سازش انگریزی ذہن میں جنمی اور اس کو پود ملی اُن ہندوستانی سیاسی رہنماؤں سے جن پر مہاتما گاندھی، نہرو اور آزاد سے آگے نکل جانے کی دھن سوار تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تقسیم کو جیسے دیکھا ویسے تحریر کیا۔ انہوں نے نہ تو کسی قسم کی جانبداری سے کام لیا اور نہ ہی کسی ایک قوم، ذات یا برادری کے لیے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک ایسے تاریخ داں کے طور پر دکھائی دیئے جو حقیقت میں ایک ہندوستانی محقق اور تاریخ پیش کرنے والا ہے۔ انہوں نے مسلم ہوتے ہوئے نہ تو ہندوؤں کو ذمّہ دار ٹھہرایا اور نہ ہی مسلمانوں کو مظلوم۔ جہاں پر مسلمانوں نے کسی غیر مسلم پر زیادتی کی مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی پر زور مخالفت کی ۔ وہیں جہاں مسلمانوں پر زیادتی ہوئی مولانا آزاد نے ایسے حساس موضوع کو بڑے ہی باوقار اور غیر جانبدار طریقے سے پیش کیا۔ کیوں؟ تاکہ نتیجہ قاری اخذ کرے نہ کہ وہ مولانا کے

جذباتوں کی رو میں بہہ کر کسی ایک طبقہ کو اس کا ذمہ دار گردانے۔ مولانا کی تحریروں کو ایک ایسے محقق اور تاریخ داں کی تحریریں سمجھنا چاہیے جنھوں نے اپنے ذاتی نظریات سے اوپر اُٹھ کر حقیقت کو پیش کیا ہے۔ آیئے مولانا کی اُن تحریروں کا جائزہ لیں جس میں انہوں نے تقسیم ہند کو پیش کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذاتی نظریہ وہی ہے جو انہوں نے تقسیم سے پہلے جناح اور دیگر قومی رہنماؤں کے سامنے رکھا تھا۔ انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ وہ تقسیم ہند کے بالکل حامی نہیں۔ تقسیم کے حالات ایسے نہیں تھے جن سے منہ موڑا جاتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت بن کر تاریخ میں رقم ہے جس نے ہندو مسلم کو آپس میں لڑا ڈالا۔ مولانا اس بات سے بخوبی واقف تھے کے ہندوستان کی فلاح و بقاء کے لیے ان مذاہب کا ایک ہونا لازمی امر ہے لیکن انگریزوں نے جاتے جاتے اپنی بنیادی پالیسی کو عملی جامہ پہنایا اور پھوٹ ڈال گئے۔ ہندستان میں ذات اور قوم کی بنیاد پر جس قدر جھگڑے ہوئے اُس کا سارا نہیں تو بڑی حدتک ذمہ کانگریس پارٹی کی پالیسیوں کو جاتا ہے جسکے فیصلوں نے ایک طرح سے تقسیم کے لئے راہ ہموار کردیں تھی۔ آزاد نے تمام حالات کا تجزیہ کیا ہے وہ ان حالات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> ”میں نے حتی الوسع اپنے فہم و فراست کے مطابق قدم اُٹھایا ، مگر اس وقت سے معاملات نے جو شکل اختیار کی ہے اس کی بنیاد پر میں یہ سمجھنے لگاہوں کہ

میری سیاسی زندگی کی شاید
سب سے بڑی بھول تھی۔ میں اپنے
کسی فعل پر اتنا پشیمان نہیں ہوا
جتنا کہ اس نازک مرحلے میں
کانگریس کی صدارت سے اپنا نام
واپس لینے کے فیصلے پر یہ ایک
اپنی غلطی تھی جسے گاندھی جی
کے لفظوں میں ”ہمالیائی جہات
“ والی غلطی کا نام دے سکتا
ہوں۔

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد۔صفحہ نمبر:۱۰۔۲۰۹)

یہ جملے مولانا نے کانگریس پارٹی کی صدارت کو چھوڑنے پر کہے تھے۔اُن کے تجزیہ کے مطابق انھوں نے دوایسی بڑی غلطیاں کیں جس کی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کو تقسیم سے بچایا جا سکتا تھا۔پہلی کا ذکر وہ خود اوپر کر چکے انھیں کانگریس کی صدارت ایسے نازک موقع پر کسی دوسرے شخص کے حوالے نہیں کرنی چاہیے تھی کیوں کہ حالات دن بہ دن کچھ اور ہی رُخ اختیار کر رہے تھے۔ملک کی نبض پر جتنی پکڑ مولانا آزاد کی تھی شاید اُس وقت گاندھی کے بعد کسی اور کی رہی ہوگی اس پر مولانا آزاد کا کی یہ تحریر روشنی ڈالتی ہے۔

”کانگریس میں ایک عام احساس
یہ تھا کہ چونکہ ابھی تک میں نے
مذاکرات چلائے تھے، اس لیے
مجھے ہی انھیں ایک کامیاب
نقطۂ تکمیل تک لانے اور ان کے
مطابق تعمیل کیے جانے کا مرحلہ
بھی سونپا جانا چاہیے۔
..........بنگال، بمبئی، مدراس،
بہار اور یوپی کے کانگریس حلقے
کھل کر یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ
آزاد ہندوستان کو اپنے سفر پر
لگانے کی ذمّے داری مجھ کو ہی
دی جانی چاہیے۔“

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد۔صفحہ نمبر:۲۰۹)

ایک اور جگہ ایسی تحریر بھی ملتی ہے جس کی بنیاد پر ہم مولانا آزاد کو گاندھی جی سے زیادہ سیاسی بصارت والا کہہ سکتے ہیں یہ واقعہ تمام ہندوستانی لیڈروں کو قید میں ڈالتے وقت پیش آیا۔جن میں خود مہاتما گاندھی بھی شامل تھے۔

”ہم نے دو منٹ بات کی ہوگی کہ
گاندھی جی نے کہا، ’آپ جیسے

ہی اپنی منزل پر پہنچیں ، حکومت کو مطلع کر دیجیے کہ آپ کانگریس کی حثیت سے اپنا کام جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آپ کو اپنے پرائیوٹ سکریٹری اور دوسری ضروری سہولتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے ۔ جب پچھلی بار آپ گرفتار کیے گئے تھے اور مینی جیل میں رکھے گئے تھے، حکومت نے یہ سہولتیں مہّیا کی تھیں۔ آپ کو انہی سہولتوں کا مطالبہ پھر سے کرنا چاہیے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو اس (مطابے) کو ایک مسئلہ بنا لینا چاہیے۔

میں گاندھی جی سے اتفاق نہیں کر سکا ۔میں نے انھیں بتایا کہ اب صورت حال قطعاً مختلف تھی۔ ہم نے کھلی آنکھوں سے یہ راستہ

چُنا تھا اور اب ہمیں اس کے نتائج کو بھگتنا پڑے گا۔ میں یہ تو سمجھ سکتا تھا کہ وہ کسی ایسے مسئلے کی بنیاد پر، جسے کانگریس نے اختیار کیا ہو، یہ چاہتے ہوں کہ میں لڑائی کروں ، لیکن اس کا جواز کیا ہو سکتا تھا کہ میں محض چند سہولتوں کی فراہمی جیسے چھوٹے مسئلے کو لیکر لڑپڑوں ...... میں نہیں سمجھتا تھا کہ میرا یہ مطالبہ حق بجانب ہوگا کہ میرے پرائیویٹ سکریٹری کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی جانی چاہیے تا کہ میں کانگریس کا کام جاری رکھ سکوں ۔ یہ معاملہ بہ مشکل اس قابل تھا کہ اس کی بنیاد پر ، موجودہ صورت حال میں ، میں ایک جھگڑا کھڑا کروں۔“

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف:مولانا ابوالکلام آزاد۔صفحہ نمبر:۱۳۔۱۱۲)

مولانا کی سیاسی فراست بہت اعلیٰ سطح کی تھی اسی لیے اُن کے ان اعترافات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے رنجیدہ رہے ہونگے ، اُنھیں اپنی تمام زندگی ان غلطیوں کا کس قدر احساس رہا ہوگا۔ اپنی پہلی غلطی کا اعتراف کر چکنے کے بعد مولانا آزاد نے دوسری کے متعلق جو بات کہی وہ ان کے حق گو اور صادق ہونے کی دلیل ہے۔ یہ مورخ اپنے ملک کی تاریخ رقم کرتے وقت اس بات پر نادم ہے کہ اُس سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جس نے ملک کی تقدیر بدل کر رکھدی۔ لیکن اس بات کو بھی سمجھنا چاہیے کہ اُس وقت جبکہ ملک کے حالات اور کانگریس پارٹی کے اندورنی مسائل انتہائی حساسیت کا شکار ہو چلے تھے مولانا آزاد کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا۔ آزاد نے ایک ایسی بات کا اعتراف کیا جس سے شاید بیشتر لوگ متفق نہ ہوں لیکن چونکہ بات یہاں تقسیم ہند پر مولانا آزاد کے نظریات کی ہورہی ہے اس لیے اس کا ذکر بہ بانگ دہل کیا جانا ضروری ہے۔ مولانا اپنی دوسری غلطی کا اعتراف خود ہی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

”میری دوسری غلطی وہ تھی جب
میں نے خود نہ کھڑے ہونے کا
فیصلہ کر لیا تھا اور میں نے
سردار پٹیل کی حمایت نہیں کی۔
ہم بہت سے معاملات میں
اختلافِ رائے رکھتے تھے، مگر

مجھے یقین ہے کہ میرے بعد اگر
وہ صدر کانگریس ہوتے تو وہ اس
کا خیال رکھتے کہ کیبنٹ مشن
پلان کا اطلاق کامیابی کے ساتھ
کیا جائے۔ وہ جواہر لال والی
غلطی کبھی نہ کرتے جس نے
مسٹر جنّاح کو سارا منصوبہ
خراب کردینے کا موقع فراہم کر
دیا۔

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف:مولانا ابوالکلام آزاد۔صفحہ نمبر:۲۱۰)

واقعہ کی تفصیل میں جائے تو بات یہ ہوئی تھی کہ مولانا آزاد ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے صدر نامزد ہوئے اور اُس دور کے مطابق انھیں ایک سال کے بعد اپنے عہدے سے سبکدوش ہوجانا تھا۔ لیکن اس امر میں بقول مولانا آزاد ”جنگ اور انفرادی ستیا گرہ کی تحریک“ معنٰی ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں تمام کانگریسی ممبران کو قید کرلیا گیا ساتھ ہی کانگریس کو ایک غیر قانونی تنظیم قرار دیا گیا۔ جس کے سبب ۱۹۴۶ء تک مولانا آزاد ہی کانگریس کے صدر بنے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں حالات جب بہتر ہوئے تب یہ بات اُٹھی کہ مولانا کو اب اپنی صدارت سے سبکدوشی اختیار کر کے صدارت کسی اور کے سپرد کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ”سردار پٹیل“ کے حامیوں نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ پٹیل اور اُن کے حامیوں کی دلی خواہش تھی کہ سردار پٹیل کو ہی نیا

کانگریس صدر منتخب کیا جائے۔ یہاں ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے، مولانا آزاد نے جو پالیسی اختیار کی تھی ان کے مطابق اس پر عمل آوری انتہائی ضروری تھی۔ آزاد نے اپنی صدارت کے دوران آزادی ہند کے لئے ایک مشن پلان تیار کیا تھا جس میں ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد کیے جانے والے اوّلین کاموں پر تفصیلی و نکاتی تحریر موجود تھی۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان نکات اور اس مشن پلان کے اندر تحریر کردہ بہت ساری باتوں سے مسلم لیگ اور جناح بالکل متفق نہ تھے بلکہ وہ کھلے محارہ اسے مسلم خلاف مشن پلان کہا کرتے تھے، اور اس مشن پلان کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کی تمام کوششیں اس مسلم دشمن پلان کو کسی طرح روکنے کی تھی لیکن مولانا آزاد کے طریق کار اور مستقل مزاجی کے سبب وہ کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔ اب جبکہ مولانا آزاد خود کانگریس کی صدارت کو خیر باد کہہ رہے تھے اُنھیں بڑا خدشہ یہ لاحق ہوا کہ کہیں کوئی ایسا صدر (یہاں مراد۔ سردار پٹیل ہے) آ گیا جو میری پالیسیوں کی مخالفت کرے تب اُن کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ اس لئے مولانا آزاد نے بہت سوچ سمجھ کر ''پنڈت جواہر لال نہرو'' کو اپنا نائب منتخب کیا۔ چونکہ جواہر لال نہرو مولانا ابوالکلام آزاد کی پالیسیوں سے کافی حد تک متفق تھے اور ہمیشہ مولانا سے اتفاق رائے رکھتے تھے مولانا ابوالکلام آزاد کو گمان ہوا کہ نہرو کا صدر بننا زیادہ سود مند ثابت ہوگا بہ مقابلہ سردار پٹیل کے۔ لیکن یہ ایک فاش غلطی ثابت ہوئی۔ آزاد پر بلکہ تمام ہندوستان پر اس بات کا عقدہ تب کھلا جب نہرو نے اخباری نمائندوں کو انٹرویو دینے کے دوران آزاد کے پالیسیوں کے کچھ نکات پر اعتراض کرتے ہوئے کانگریس کو اس سے الگ کر لیا۔ اس سلسلے میں یہ تحریر دیکھئے۔

''اب ان بد نصیب واقعات میں سے جو تاریخ کا رُخ بدل دیتے ہیں، ایک واقعہ پیش آیا..... ۱۰ / جولائی کو جواہر لال نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں انھوں نے ایک حیران کن بیان دیا۔ بعض اخباری نمائندوں نے ان سے پوچھا کہ اے۔آئی۔ سی۔سی کے ذریعہ قرار داد کے منظور کر لیے جانے کے ساتھ کانگریس نے پلان کو، بشمول انٹرم حکومت کی تشکیل کے، جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔ جواب میں جواہر لال نے کہا دستور ساز اسمبلی میں کانگریس یوں داخل ہوگی کہ .... ''سمجھوتوں سے یکسر آزاد ہوگی اور تمام حالات جو رونما ہو سکتے ہیں، ان کا سامنہ اپنی مرضی کے

مطابق کرے گی"۔
اخباری نمائندوں نے مزید دریافت
کیا کہ اس کا مطلب کیبنیٹ مشن
پلان میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔
جواہر لال نے پر زور انداز میں
جواب دیا کہ کانگریس صرف
رضامند ہوئی تھی کہ دستور ساز
اسمبلی میں شرکت کر لے گی، اور
وہ اپنے آپ کو اس کے لیے آزاد
سمجھتی ہے کہ اس کے نزدیک
جو مناسب ترین صورت ہو اسی
کے مطابق کیبنیٹ مشن پلان کو
تبدیل کرے یا اس میں ترمیم
کردے۔"

(بحوالہ:۔ ہماری آزادی۔ مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد۔ صفحہ نمبر: ۲۱۲-۱۳)

نہرو کے اس عمل نے محمد علی جناح کو ایسا موقع فراہم کر دیا جس کا انھیں کافی عرصہ سے انتظار تھا۔ جناح نے آزاد کے دباؤ میں اس مشن پلان کو قبول کر لیا تھا جس کی وجہ سے تمام مسلم لیگ اور اُن کے اپنے سیاسی حلقے میں ان پر کافی طنز کسا گیا کہ الگ اسلامی ریاست جس کا جناح ہمیشہ ذکر کرتے رہے تھے سب خواب معلوم ہوتا

ہے۔ نہرو کے اس بیان نے جنّاح کو وہ راہ مہیا کروادی جس کے ذریعہ وہ اپنے ہمنواؤں میں دوبارہ سرخرو ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جنّاح نے مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس سلسلے میں جنّاح نے اپنی پارٹی کی طرف سے جو بیان جاری کیا اُسے مولانا آزاد نے قلم بند کیا ہے۔

"مسٹر جناح نے اُسی روز ایک
بیان جاری کیا جس میں انھوں نے
کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی
کا تازہ ترین ریزولیوشن جو واردھا
میں ۱۰/اگست کو منظور کیا گیا
ہمیں کوئی راستہ نہیں دکھاتا
کیونکہ اس میں کانگریس کے اُسی
موقف کی تکرار ہے جو بالکل
شروع سے ہی کانگریس نے اختیار
کر رکھا تھا۔ بس اُسے نئے لفظوں
میں پیش کر دیا ہے۔"

(بحوالہ:۔ ہماری آزادی۔ مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد۔ صفحہ نمبر: ۲۱۸)

جواہر لال کے بیان نے ایک ایسی سازش کی راہ ہموار کر دی جسے مسلم لیگ کافی عرصہ سے تیار کیے بیٹھیں تھی جب تک مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس صدر رہے کسی مسلم لیگی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس سازش پر عمل آور ہوتا لیکن جواہر لال کے صدر

بنتے ہی اس سازش نے زور پکڑ لیا۔نہرو کے اس انٹرویو کے بعد جناح نے مسلم لیگ کی ایک مجلس بلوائی اور کھل کر اپنے نظریات کو پیش کیا اور ۱۶/اگست کو براہِ راست کاروائی کا دن(Direct to Action day) کے طور پر مقرر کر دیا۔اس فیصلے نے پورے ملک میں کھلبلی مچادی۔کسی کے علم میں نہیں تھا کہ ۱۶/اگست کو جناح کیا کرنے والے ہیں۔لیکن جب ۱۶/اگست آیا تو ہندوستان ایک ایسے سانحہ سے دوچار ہوا جس کا گمان بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔یہ دن ملک کے اُس بھائی چارے پر نقب کا دن ثابت ہوا جس نے صدیوں سے یہاں پر رہنے والوں کو جوڑے رکھا تھا۔مسلم لیگ کے حامیوں نے ہندو مسلم اتحاد پر بہت کاری ضرب لگائی۔اُس دن جس قسم کا تشدد ہندوستان کی سرزمین پر ہوا وہ ملک ہند کی تاریخ میں باعث ننگ وشرم تھا۔اس کی تفصیل مولانا خود بیان کرتے ہیں۔

”ہندوستان کی تاریخ میں
۱۶/اگست ایک یوم سیاہ تھا۔عام
تشدد نے جس کی کوئی نظیر
ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی
،کلکتہ کے عظیم الشان شہر کو
خوں ریزی ، قتل اور دہشت کے
ایک طوفان میں جھونک دیا۔
سینکڑوں جانیں ضائع گئیں،
ہزاروں گھائل ہوئے اور کروڑوں

روپیے کی املاک تباہ کردی گئی۔
ملک کی طرف سے جلوس نکالے
گئے۔ جنھوں نے لوٹ مار اور آتش
زنی شروع کردی۔ جلد ہی پورا
شہر دونوں فرقوں کے غنڈوں کی
گرفت میں آگیا۔“

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف:مولانا ابوالکلام آزاد۔صفحہ نمبر:۲۱۹)

شروعات مسلم لیگیوں نے کی اور بعد کو اسکو ہوا دینے وہ فرقہ پرست عناصر کام کرنے لگے جن کا مقصد ہی ہندو مسلم یکجہتی کو ختم کرنا تھا۔اس کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ اور محمد علی جناح پر جاتی ہے۔جناح کا براہِ راست کاروائی کا دن ہندوستانی تاریخ کا سیاہ دن ثابت ہوا۔یہاں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد نے جب ملک کی تاریخ رقم کی تب مکمل غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے انھوں نے لیگ کی جس طرح تصویر کھینچی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا ہر ہندوستانی کو صرف ہندوستانی سمجھتے تھے نہ کہ مذہب کی عینک لگا کر ذاتی نظریات پر کسی کے حق اور باطل ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا کرتے تھے۔مولانا نے مسلم لیگ کے اس حرکت کو غنڈہ گردی قرار دیا۔اس شرمناک حادثہ کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس میں دوریاں مزید بڑھ گئی یہاں تک کے حتمی فیصلہ پر بات آگئی۔جناح نے اپنے ہمنواؤں کو ساتھ لیا اور نئے اسلامی ملک کی تیاری میں لگ گئے اور ملک کو تقسیم کر کے ہی دم لیا۔مولانا آزاد اپنے ظرف کے عین مطابق انھیں سمجھاتے رہے جس میں انھیں ہمیشہ ہی ناکامی ہاتھ لگی

نتیجہ ملک کی تقسیم پر جا کر تھا۔ایک اعلیٰ ظرف کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے ان باتوں کا اعتراف کیا جس کے وجہ سے یہ تمام حالات سے ملک دوچار ہوا۔

”میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ جب میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ غلطیا ں مجھ سے سرزد نہ ہوئی ہوتی تو پچھلے دس برسوں کی تاریخ شاید محتلف ہوتی“

(بحوالہ:۔ہماری آزادی۔مصنف:مولانا ابوالکلام آزاد)

☆

عصمت چغتائی حیات اور ادبی خدمات

اُردو ادب میں ایسے کئی شخصیات موجود ہیں جن کی وجہ سے اُردو ادب کو نہ صرف جلا ملی بلکہ یہ ادب تمام دیگر قدیم وجدید زبانوں کی برابری کرنے لگا۔اس ادب میں ایسے ایسے گوہر پارے اُبھرے ہیں جن کی تحریروں کی بدولت اس زبان کو عروج حاصل ہوا۔انہیں گوہر پاروں میں ایک عصمت چغتائی بھی رہیں۔ادب میں جتنا حصہ مردوں کا رہا ہے اُس سے کہیں زیادہ خواتین کا نظر آتا ہے۔اُردو ایک ایسی زبان کے طور پر جانی گئی جس میں احترام،نرماہٹ،شگفتگی،اور بانکپن سبھی کچھ موجود ہے اور

بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ اس ادب میں خواتین کا حصہ ہے۔یہ زبان شاعری سے شروع ہوئی اور اس کا مقصد عورتوں کی تعریف سے لیکر ان کی مختلف اشیاء کے حسن و جمال اور خوبصورتی کا دکھانا ہی رہا۔اسی سبب اس زبان میں ایسی چاشنی پیدا ہوئی کہ اس کا زمانہ گرویدہ ہوا۔جب اس زبان کا مقصد ہی خواتین اور ان کے اطراف کی دنیا کو پیش کرنا تھا تو ایسے میں اس کی اہمیت مزید اضافہ ہی ہوا۔اس زبان کو بعد میں چاہے جس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہو لیکن اس کی بنیاد میں ہی عورت اور اُس سے متصل باتوں کا ذکر ہے۔اب اگر کوئی خاتون اس زبان میں اپنا مقام پیدا کرتیں ہے تو اس کی ادب میں خاص اہمیت لازی امر ٹھہرا۔عصمت چغتائی اُردو کی اُن چنندہ خواتین میں شمار ہوتیں ہیں جن کی تحریروں نے ادب کو مزید نکھارا ہے۔ادب میں کئی نام ایسے ہیں جنھوں نے نسواں کے مسائل اور ان کی حالات زندگی کو اپنی تحریروں کا محور بنایا ہے۔لیکن بات کچھ اور ہو جاتی ہے جب کوئی خاتون اپنے اور اپنے ہم جنسوں کے مسائل کو ادب میں پیش کرتی ہے۔اس امر سے خواتین کے ان پوشیدہ احساسات کی جانب قاری کی توجہ مبذول ہوتی ہے جس کا اُسے آج تلک نہ تو علم تھا اور نہ ہی احساس۔

گرچہ زندگی اور اس سے متصل مسائل عموماً سبھی سے لیے یکساں، کچھ کم تو کہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔لیکن بعض ایسی باتیں خصوصاً احساس ایسے ہوتے ہیں جس کی نشاندہی بہت ضروری عمل ٹھہرتی ہے۔اگر انکا ذکر نہ ہو تو سماج میں ابتری اور بے چینی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔خاص طور پر خواتین کے مسائل اور ان پر نسواں کی سوچ کو جاننا اور سمجھنا بے حد ضروری ہے۔یہیں عصمت چغتائی جیسی مصنفہ کا رول سامنے آتا

ہے۔

عصمت کا مکمل نام عصمت خانم چغتائی ہے۔ان کی پیدائش ۲۱/اگست ۱۹۱۵ء کو بھوپال میں ہوئی۔لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گزرا۔والد کا نام مرزا قسیم بیگ چغتائی تھا جو کہ اپنے زمانے کے بڑے جج تھے۔والدہ نصرت خانم چغتائی ایک خانہ دار خاتون تھیں لیکن کافی حد تک سوشل تھیں۔عصمت کا سلسلۂ نسب چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔بعد کو آگرے کے میونسپل اسکول سے ۸ جماعت تک ہوئی۔جماعت نہم سے میٹرک تک علی گڑھ کے اسکول میں تعلیم پائی۔بی۔اے،آئی ٹی کالج لکھنؤ سے کیا اور بی۔ایڈ کے لیے دوبارہ علی گڑھ لوٹیں۔عصمت کو شروعات ہی سے ادب سے دلچسپی رہی۔یہی سبب رہا کہ انھوں نے دیگر فیلڈ میں باوجود مواقع ہونے کے ایک معلم بننا ہی پسند کیا۔وہ جہاں پر بھی رہیں اپنے آپ کو ایک معلم کے کردار میں ہی پیش کیا۔اُنھوں نے کئی جگہ پر نوکری کی جس میں ریاست جاورہ کا گرلز کالج ہے جہاں بطور ہیڈ مسٹریس کام کیا۔بعد کو اسلامیہ گرلز کالج، بریلی میں بھی اسی عہدہ پر رہیں۔بمبئی آکر انھوں نے راج محل، گرلز کالج میں بطور پرنسل عہدہ سنبھالا اور یہی سے سپر ٹنڈنٹ آف میونسپل اسکول، کی عہدہ تک پہنچی۔عصمت کو خواتین کی تعلیم اور ان کی معاشی حالات کی بہت فکر تھیں اسی سبب انھوں نے جہاں بھی نوکری کی ہمیشہ عورتوں کے لیے اور ان کی سماجی اور معاشی حالات کی بہتر بنانے پر کام کیا ہے۔عصمت نے اپنے تحریروں کے سبب ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔وہ خود ایک خاتون تھیں اور خواتین کے مسائل اور اُس کے کردار کی عکاسی جس طرح عصمت کے پاس ملتی ہے اس کی مثال کسی اور مصنف کے پاس

شاید ہی ملے۔ان کی ادبی خدمات کے تحت انھیں کئی انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں غالب ایوارڈ، (۱۹۷۴ء)، فلم فیئر ایوارڈ (۱۹۷۵ء)، پدم شری ایوارڈ (۱۹۷۵ء)، سمان ایوارڈ آف اُردو لیڈریچر (۱۹۹۰ء)، اقبال سمان، ریاست مدھیہ پر دیش (۱۹۹۰ء)، پرویز شاہی ایوارڈ، مغربی بنگال اُردو اکادمی، مخدوم ایوارڈ اور نہرو ایوارڈ جیسے اعزازات قابل ذکر ہیں۔عصمت جہاں ایک طرف ایک معلم کی حیثیت رکھتی تھیں وہیں دوسری جانب ایک بڑی مصنفہ اور قلم کار کے طور پر جانی جاتی تھیں۔انھوں نے ادب میں کئی شاہکار ناول، افسانے، ڈرامہ، اسکرپٹ نویسی، ناولٹ، خاکے، رپورتاژ، مضامین، لکھے ہیں جن کی ادب میں اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔اس کے علاوہ خودنوشت بھی تحریر کی ہے۔

عصمت کی زندگی اور تحریریں کئی مختلف باتوں کا مجموعہ رہی۔وہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہیں۔ان کی کئی بہترین اسکرپٹوں پر فلمیں بنائی گئیں۔ان کی فلمی زندگی بے حد شاندار رہی ہے۔ان کی کئی فلمی اسکرپٹوں پر مشہور فلمی ہستیوں نے کام کیا ہے جس میں دیوانند کا نام بھی ہے۔عصمت کی جن اسکرپٹوں پر فلمیں بنی اُن میں ”چھیڑ چھاڑ، ضدی، آرزو، بزدل، شیشہ، فریب، دروازہ، سوسائٹی، سونے کی چڑیا، گرم ہوا (جو کہ انھوں نے خود بنائی) جنون“ وغیرہ جیسی فلمیں بنیں۔عصمت کی ایسی کئی تحریریں ہیں جن پر کئی اعتراضات بھی کیے گئے۔یہی حال اُن کی زندگی کا بھی ہے لوگوں نے اُن کے رہن سہن اور عادات واطوار پر بھی بہت کچھ کہا لیکن انھیں اس سے کبھی کوئی فرق نہ پڑا۔ان کی معترض تحریروں میں ایک ”لحاف (۱۹۴۲ء) میں لاہور سے شائع ہوئی“ ہے۔اس پر لاہور ہائی کورٹ نے اُن پر مقدمہ چلایا تھا۔

عصمت کی ادبی زندگی کی بات کریں تو ان کا سب سے پہلا افسانہ ”ڈھیٹ، مارچ ۱۹۳۸ء“ میں منظر عام پر آیا۔پہلا ڈرامہ ”فسادی ۱۹۳۸ء“ پہلا افسانوی مجموعہ ”کلیاں ۱۹۴۱ء“ میں لاہور سے چھپا۔پہلا ناول ”ضدی ۱۹۴۱ء“ میں علی گڑھ سے پبلش ہوا۔پہلا خاکہ ”دوزخی ۱۹۴۲ء“ ان کی پہلی فلم ”چھیڑ چھاڑ ۱۹۴۳ء“ پہلا مضمون ”کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے ۱۹۵۹ء“ ان کا پہلا ناولٹ ”تین اناڑی ۱۹۶۰ء“ میں منظر عام پر آیا اور پہلا رپورتاژ ”بمبئی سے بھوپال تک ۱۹۷۹ء“ کواورکومنظر عام پر آئی۔

عصمت کے فن پر بات کی جائے تو ان کے پاس تمام نثری اصناف پر طبع آزمائی ملتی ہے۔انھوں نے ادب کو نہ صرف سمجھا ہے بلکہ اس کے اسرار و رموز سے بھی مکمل واقفیت رکھتیں ہیں۔ان کے پاس زمانے کے حالات، ماحول کی عکاسی، سماجی مسائل اور ان کا حل، حقیقت پسندی، سبھی کچھ نظر آتا ہے۔انھوں نے جو کچھ دیکھا، سمجھا اسے اپنے ہی انداز میں تحریر کیا ہے۔ان کی تحریروں میں بلا کی مشاقی اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔قاری ان کی تحریروں میں تشنگی محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ ایسی باتوں کو سمجھ لیتا ہے جو کھل کر نہ کہی جاسکتی ہو۔عصمت کا سب سے اہم کارنامہ ان کی تحریروں میں خواتین کے کردار ہیں۔ان کی تحریروں میں مسائل نسواں جس انداز میں ملتا ہے اس کی مثال کسی ادیب اور مصنفہ کے پاس نہیں ملتی۔

عصمت کی تحریروں میں کل 7 افسانوی مجموعے ہیں جن میں سماجی حالات اور نسوانی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہیں۔ان مجموعوں کے نام ”کلیاں، ایک بات، چوٹیں، دو ہاتھ، چھوئی موئی، بدن کی خوشبو، آدھی عورت آدھا خواب“ ہیں۔اس کے

علاوہ ان کے ناولوں میں ''ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، عجیب آدمی، ایک قطرۂ خون، جنگلی کبوتر، کاغذی پیرہن'' جیسے اہم ناول ہیں۔ ناولٹ میں ''تین اناڑی، نقلی راج کمار، دل کی دنیا'' اور ڈراموں میں ''شیطان'' جیسی ادبی تحریروں موجود ہیں جن کے تحت اس مصنفہ کو ادب میں جانا جاتا ہے۔

حالانکہ عصمت کے معاصرین میں قرۃ العین حیدر، خالدہ مسرور، ہاجرہ بیگم جیسی خواتین بھی موجود تھیں لیکن بعض چیزوں پر عصمت کو فوقیت حاصل ہے اس کی وجہ اُن کی ادبی فکر اور سماجی تحریریں ہیں۔ عصمت کے پاس جس طرح کا ماحول اور سوسائٹی ملتی ہیں وہ کسی اور کی تحریروں میں نظر نہیں آتی۔ وہ شروعاتی دور میں حجاب امتیاز علی سے کافی متاثر تھیں۔ انھوں نے اپنی رومانی تحریریں انھیں سے متاثر ہو کر لکھیں۔ لیکن بعد کو وہ ترقی پسند نظریہ سے اس حد تک متاثر ہوئیں کہ اس نظریہ کو قبول کیا اور اسی کے تحت اپنی تحریریں ادب میں پیش کیں۔

عصمت سے پہلے خواتین افسانہ نگاروں میں بیگم حجاب اسماعیل، رشید جہاں، مسز عبدالقادر کے نام قابل ذکر ہیں لیکن جس طرح عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں سے مرد افسانہ نگاروں کے بیچ اپنا مقام پیدا کیا اس کی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں:

''اب دیکھیے ڈاکٹر رشید جہاں نے جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ 'انگارے' نامی مجموعے میں شرکت کی تو کیا ہوا؟ سب سے

زیادہ لعنت و ملامت اور فتوؤں کا نشانہ بنیں حالانکہ رشید جہاں معمولی سی سماجی تنقید سے آگے نہ بڑھی تھیں۔ اب ایسے عالم میں 'انگارے' والے ہنگامے کے تھوڑی عرصے بعد ہی عصمت چغتائی یوں آئیں جیسے جوالا مکھی پھٹ گیا ہو۔

(عصمت چغتائی ایک تاثر'' از ہاجرہ مسرور''، عصمت چغتائی اور فن (مترب) ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ص ۹۶۔۵۹۵)

عصمت عورت کے وجود، عورت کی شخصیت، سماج میں عورت کا مقام، اور دیگر تمام شعبوں میں اس کی کارکردگی کو بڑے ہی اچھے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ وہ کبھی کسی خاتون کو کمزور اور لاچار نہیں سمجھتی۔ بلکہ تمام سوسائٹی کو اس ذمہ داری کا احساس کرواتی ہیں کہ عورت کی اس سماج میں کیا اہمیت ہے اور اس کے ساتھ کیا کچھ ظلم ہو رہے ہیں۔ عورت کی محکوم و پست حیثیت اور اس پر ہونے والے ظلم واستحصال کے متعلق مختلف پہلوؤں سے سوال اُٹھاتی ہیں۔

عورت معاشرے کا ایک ایسا طبقہ ہے جسے ہر زمانے میں کمزور مانا گیا اور اس کی قابلیت کے اظہار سے پہلوتہی کی گئی۔ عصمت کو اس بات سے اعتراض ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مرد حضرات عورتوں کو محض ایک object کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ

چاہتی ہیں کہ خواتین کو بھی مساوی حقوق ملے اور ان کا بھی سماج میں وہی درجہ رہے جو مردوں کا ہے۔وہ ایک بیباک مصنفہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ان کے پاس حقیقت پسندی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے لیکن کبھی کبھی یہ انتہا پسندی نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔وہ مردوں اور سوسائٹی کو آئینہ دکھانے کی کوشش میں ادب کی اُن حدود کی پاسداری کو بھی قائم نہیں رکھ پاتیں جو ادب کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن مجموعی طور پر عصمت ایک حساس طبیعت اور ایک بے باک مصنفہ کے طور پر جانی گئیں جسے نہ صرف سماج اور ماحول کا علم ہے بلکہ وہ اپنا الگ نظریہ قائم کرنے میں اور اس پر چلے میں بھی کامیاب نظر آتیں ہے۔

عصمت کی تحریوں کا سب سے نمایاں اور اہم موضوع تانیثیت اور عورت کے مسائل ہیں اور خود عصمت چغتائی نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے۔کل ملا کر دیکھیں تو عصمت چغتائی نے اپنے باغیانہ رجحان کے سبب معاشرے میں پھیلے فرسودہ روایات، معاشرتی تضادات، اور ظلم و جبر پر اپنی تحریروں کے تحت ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ان کی کہانیاں اپنے مواد، تکنیک اور پلاٹ کی وجہ سے چونکا دینے والی ہیں۔

یہ مصنفہ ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو رات ہی میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملی ان کی عمر اُس وقت ۷۶ سال کی تھی۔ان کی وصیت کے مطابق انھیں چندواڑی کے شمشان گھاٹ میں نذرِ آتش (جلایا) کیا گیا۔

☆

افسانہ رقص نا تمام
میں نسوانی مسائل کی عکاسی

''عزیز احمد'' کا نام اردو ادب کے اُن چند نامور شخصیات میں سے ہے جو کسی تعریف کے محتاج نہیں۔عزیز احمد کی پیدائش ۱۱/نومبر ۱۹۱۴ء کو بارہ بنکی اُتر پردیش میں ہوئی۔اُن کے والد کا نام ''بشیر احمد'' تھا جو کہ پیشہ سے وکیل تھے اور وکالت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں آ بسے تھے۔عزیز احمد بچپن ہی سے ذہین اور بے حد حاضر جواب تھے۔ان کی اسی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں جامعہ عثمانیہ یو

نیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری اعلیٰ نمبرات سے حاصل کی جس کی بناء پر انھیں ریاستِ حیدرآباد کا وظیفہ آسانی سے مل گیا۔وظیفہ ملنے کے بعد عزیز احمد نے اعلیٰ تعلیم کی حصول کی خاطر لندن کا رُخ کیا۔لندن سے لوٹنے پر جامعہ عثمانیہ میں ہی نوکری کرلی اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ انگریزی کے ریڈر مقرر ہوئے۔دوسال بعد انھوں نے اپنی نوکری چھوڑ کر ’’آصف سابع نظام‘‘ کی بہو ’’شہزادی دُرِّشہوار‘‘ کے سیکریٹری کا عہدہ قبول کر لیا اور کافی وقت تک شاہی خاندان سے ہی منسلک رہے۔مگر کچھ وقت بعد طبیعت کی بے چینی اور ادبی مزاج کے باعث شاہی خاندان کو خیر باد کہا اور دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔تقسیم ہند ایک ایسا سانحہ تھا جس کا اثر عزیز احمد کی زندگی پر بھی کافی گہرا نظر آتا ہے۔عزیز احمد ان لوگوں میں سے تھے جو پاکستان بننے کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔عزیز احمد نے اردو کی مختلف صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے اور ان صنفوں میں اپنی مہارت، تجربہ اور علمی فطرت کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔انھوں نے ’’ناول، ناولٹ، افسانے، تنقید، ترجمے، شاعری، سیاسیاتی تحریریں، اسلامیات‘‘ سبھی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔

’’رقص ناتمام‘‘ عزیز احمد کے اُن افسانوں میں شمار ہوتا ہے جس میں اُنھوں اپنے اسلوب کا جادو جگایا ہے اُن کے قلم نے نسوانی کردار کو قاری کے سامنے اس بہترین انداز میں پیش کیا ہے کہ اسکی مثال اردو ادب میں مشکل سے نظر آتی ہے۔کسی خاتون کی زندگی کی مکمل عکاسی ہمیں ان کے اس افسانہ میں بہت ہی جامع انداز میں ملتی ہے یہ عزیز احمد کا کمال ہے۔اس افسانے میں انھوں نے عورتوں کے جذبات، احساسات، ذہنیت اور وفاداری سے لیکر ماحول اور سماجی روایات کی اندھی تقلید سبھی

کچھ پیش کیا ہے۔

رقص ناتمام کا پلاٹ کچھ اسطرح بُنا گیا ہے کہ اس کے واقعات اور حادثات حقیقی زندگی سے قریب تر محسوس ہوتے ہے۔

افسانہ رقص ناتمام کے کرداروں میں ’’لفٹنٹ سکندر علی خان (والد)، سلطانہ (ماں)، بڑا بھائی، قیصر (پھوپی زات بہن)، بلقیس جہاں (مرکزی کردار) موجود ہیں۔

عزیز احمد نے ان کرداروں کو بڑی محنت سے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ شروعات ہی سے افسانے میں کرداروں کے ذریعے ان کے جذبات کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ساتھ ہی اُس دور کے معاشرے کو پیش کیا گیا ہے۔کرداروں میں سب سے پہلے ہمیں لفٹنٹ سکندر علی خان ہے جو کہ اپنے ماحول اور سماج سے اُکتایا ہوا اور اپنے حالات کا غلام شخص ہے۔یہ کردار اپنے اندر ایسی سوچ کا مالک ہے جو کہ اُس دور کے امراء وسلاطین میں عام تھی۔سکندر علی عورتوں کا شائق اور گھریلوں زندگی سے بیگانہ کردار ہے اسے اس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ اُس کے گھر کے کیا حالات ہیں۔ بس ایک بوجھ کے طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا چلا جاتا ہے۔

ماں کے کردار میں سلطانہ ہے جو کہ بالکل دیسی اور خانہ دار خاتون ہے۔وہ کم پڑھی لکھی، لاپرواہ اور بیگانگی سے بھرپور کردار ہے اُس میں حالات سے مقابلہ کرنے کا نا تو حوصلہ ہے اور نہ ہی جذبہ۔

تیسرا کردار اس افسانے میں بڑے بھائی کا نظر آتا ہے جسے ہر جگہ ’بڑا بھائی‘ کے نام ہی سے لکھا گیا ہے۔یہ کردار کسی حد تک حسّاس ہے۔لیکن اس میں بھی ایک

خامی یہ ہے کہ وہ بھی اُسی پرانی روایات کا غلام ہے جو کہ عورتوں کو مکمل طور پر مرد کا پابند ہونے کا حکم سناتی ہے۔ یہ افسانہ اُس دور کو پیش کرتا ہے جو اپنے اندر بڑی عجیب روایتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ اُس دور میں مسلمانوں کو خصوصاً علاقہ حیدر آباد میں یہ لگتا تھا کہ وہ سب سے اعلی اور برتر قوم ہے۔ انہیں نزاکت' ضرافت' عیاشی' اور خود مختاری کا نہ صرف دھوکہ تھا بلکہ وہ اسی کو زندگی سمجھتے تھے وہ اپنے اطراف میں ہونے والی تبدیلیوں کو نہ تو قبول کر پا رہے تھے اور نہ ہی اُسے روک پانے کا اختیار رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی زندگی ایک کھوکھلی' دیمک لگی لکڑی کے مانند ہوگئی جو کہ بظاہر بہترین اور شاندار نظر آتی ہے لیکن اُس کے باطن میں کوئی طاقت یا مضبوط جذبہ نہیں ہوتا۔

اگلا کردار قیصر کا ہے جو کہ مرکزی کیریکٹر بلقیس جہاں کی پھوپی زاد ہے۔ یہ ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو کہ دوسروں کے مقابلہ اپنی کم علمی' کم خوبصورتی' اورغربت کے باعث احساس کمتری کی شکار ہے۔ اس میں بلقیس کی سی خوبصورت نہیں اس جیسی علم اور دانشمندی نہیں، اس جیسا رتبہ و پیسہ نہ ہونے کی بنیاد پر خود کو کمتر محسوس کرنے والا کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے عورتوں میں موجود حسد و جلن کو بہ خوبی دکھایا گیا ہے۔

افسانہ کا سب سے اہم کردار ''بلقیس جہاں'' ہے یہ سارا افسانہ اسی کردار کے اطراف بُنا گیا ہے۔ عزیز احمد نے اس افسانے کو ایک عورت کی پیدائش سے لیکر اسکا بچپن، اسکا تعلیمی دور، گھر میں گذرتے ہوئے اسکے مختلف ادوار، اسکی ذہنی نشونما اور اسکی زندگی میں ہونے والے واقعات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ بلقیس جہاں

کے کردار کو مصنف نے پیدائشی دور سے دکھایا ہے۔ اسکی پیدائش سے لیکر اسکی شادی جو کہ اُس کے لیے موت کے مترادف رہی اُس کی زندگی کے ہر پہلو کی بہترین عکاسی کی ہے۔ بلقیس جہاں کی پیدائش پر گھر کے حالات سے لیکر اُس کے سن بلوغ ہونے تک پہنچنے کو افسانہ میں پیش کیا ہے۔ بلقیس جہاں کے اندورنی کیفیات و ذہنی خلفشار، اور اُس سے وابستہ افراد کی حالاتِ زندگی کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

افسانہ ''رقص نا تمام'' کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک بڑے جاگیردار کے گھر ایک لڑکی دو ایسے لوگوں کے ملنے سے وجود میں آتی ہے جو کہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ذہن کے مالک ہیں۔ نہ تو اُن میں ایکدوسرے کے لیے محبت ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کو زیادہ پسند کرتے ہے۔ وہ ایکدوسرے کا ساتھ صرف اپنی ضرورتوں کے لیے یا پھر سماج میں بھرم قائم رکھنے کے لیے دیتے ہیں۔

بلقیس ہونے سے افسانہ کے مرکزی کردار اور کہانی کی ابتداء ہوتی ہے۔ سارا افسانہ اسی کے گرد بنا گیا ہے۔ بلقیس کی پیدائش اور پھر اسکے شروعاتی قلبی کیفیات کو جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتی تھی انتہائی دلکش انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ چند لمحوں کی بچی کا 'چراغ کی لَو' سے دل لگا بیٹھنا پھر کچھ دن بعد 'چاند کی دلفریب اور خوبصورت روشنی' کو دیکھ کر خوشی اور سکون محسوس کرنا اور دائی کا اُسے چاند سے اور چاند کی روشنی سے دور کرنے پر رونا وہ بھی بناء کچھ سمجھے عجیب مگر حقیقت سے قریب واقعہ لگتا ہے۔ اس کردار کے تحت عزیز احمد ایک عورت کے بچپن، لڑکپن، جوانی اور شادی سے جڑے جذباتوں کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس کردار کے تحت وہ دکھاتے ہیں کہ کسی گھر میں والدین کی بے توجہی اور

اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنے پر کیا نتیجہ نکلتا ہے۔بلقیس ایک ایسی لڑکی ہے جس نے نئے دور کے ابتداء میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ اُن لڑکیوں میں سے ہے جسے اُس کے گھر والے تعلیم کی اجازت دیتے ہیں۔تعلیم کی روشنی میں بلقیس اپنی راہ خود تلاش کرنا چاہتی ہے مگر وہ یہ بات بھی جانتی ہے کہ اُسے کتنی بھی آزادی کیوں نہ ملی ہو آخر کو اُسے ایک ایسے سماج میں ہی رہنا ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتی۔ وہ ہر اُس بات کی پابند ہے جسے سماج اچھا سمجھتا ہے پھر چاہے وہ چیز کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔

افسانہ کا مقصد نسواں پر ہونے والی زیادتیوں کو پیش کرنا ہے۔مصنف کے پاس سب سے بڑی زیادتی کسی نسواں کی بغیر اس کی اجازت کے شادی کر دینا ہے۔ وہ یہ احساس کرواتے ہیں کہ کیسے کسی لڑکی کی اجازت کے بغیر اُسکی زندگی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُس سے ایک بار بھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ وہ اس افسانے میں انتہائی دلدوز انداز میں ایک عورت کے ذہنی کرب کو دکھاتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کیسے کوئی عورت اپنی زندگی اور مستقبل کے لیے ایک خیال بُنتی ہے اور سماج کے ٹھیکیدار اُس معصوم کو اور اُس کے حساس جذباتوں کو مجروح کر کے اُس کی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ وہ ایک جگہ بڑے ہی دلدوز انداز میں بلقیس کے جذبات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں ۔

"حجلہ عروسی کے وقت" اُس نے
ہمت کر کے آنکھیں کھولیں اور
اپنے شوہر کو دیکھنا چاہا ,پہلی
مرتبہ دیکھنا چاہا اُسے جو کچھ

نظر آیا وہ محض یہ تھا کہ ایک
انسانی چہرے کا گوشت لوہے کی
طرح سخت تھا۔ چہرے پر جذبات
نے بہیمیت پیدا کردی
تھی۔آنکھیں شکاری کی خو فناک
شکار کرنے والی آنکھیں تھیں ۔اور
اُس کا پورا جسم ' مجبور کرنے والا
' مار ڈالنے والا 'فنا کر دینے والا جا
نور تھا۔جس کے پنجوں میں وہ بے
بس تھی۔اس طرح اُس گناہِ عظیم
کا' جس کو دنیا کے ہر قانون نے
جُرم سنگین جُرم قرار دیا ہے۔اُس
کے والدین کی مرضی سے ' بغیر
اُس کی رضا مندی کے ' اُس کے
ساتھ قانوناً ارتکاب کیا گیا۔"

(افسانہ رقص ناتمام۔مصنف:عزیز احمد۔صفحہ نمبر ۱۶۷)

ان کیفیات کی اہمیت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔عزیز احمد اس افسانہ کے تحت عورتوں کے حقوق اور اُس کی پامالی سے روکتے نظر آتے ہیں وہ اس بات سے بالکل نالاں ہے کہ عورتوں کو یہ سماج مساوات کا حق کیوں نہیں دیتا اور اُن کا استحصال

آخر کب تک کیا جاتا رہیگا۔

ہمارا سماج تعلیم نسواں کے لیے بہت زور دیتا ہے۔لیکن جب کوئی خاتون تعلیم یافتہ ہوجاتی ہے اور اسے کسی مرد سے شانہ بہ شانہ کچھ کر دکھانے کا جذبہ حاصل ہو جاتا ہے تب سماج کے اُن زنگ خوردہ اشخاص کا کردار سامنے آتا ہے جو خواتین کو اپنی نشاطیہ کے لیے استعمال کرتے وقت ان کی حیا، عزت اور ان کے بہترین کردار پر کوئی نکتہ پیش نہیں کرتے لیکن جیسے ہی اس خاتون کی قوت ان کی مردانہ کدورت سے تجاوز کر دیتی ہے یہی لوگ اُس کے سب سے بڑے دشمن اور زمانے بھر میں اس کے لیے سوہانِ جاں بن کر ابھر آتے ہیں۔

یہ افسانہ سماج کی اُس ذہنی خلفشار کا آئینہ ہے جس میں ایک لڑکی بن کر پیدا ہونا سب سے بڑا جرم ہے۔ یہاں عورت ہونا اُس وقت بڑی اہم بات ہو جاتا ہے جب وہ کسی کے دل کو پہلانے کا سامان بنے۔لیکن جیسے ہی کسی نسواں کے اندر اپنے خاندان، سماج اور قوم کے لیے کچھ بہتر کرنے کا شوق غالب آتا ہے اس کے لیے یہ دنیا کی جہنم بن جاتی ہے۔سب سے پہلے اُس کا باپ پھر بھائی، اس کے بعد وہ تمام نزدیکی کردار دکھائی دیتے ہیں جن سے اسے امید ہوتی ہیں کہ وہ اس کا سہارا اور حوصلہ ہیں۔عزیز احمد نے باپ کی اُس جنسی کدورت کو پیش کیا ہے جس میں وہ نسواں کو محض ضرورت کا آلہ سمجھتا ہے۔جس کے پاس کسی خاتون کی کوئی عزت نہیں۔جس کے لیے وہ بس جسم کا لوتھڑا ہے جو اس کی ہر خواہش پر لبیک کہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔

ایک بھائی جو کہ تعلیم یافتہ ہے جانتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط لیکن جب سماج سے اپنی بہن کے خاطر لڑنے کی بات آئی وہ پیچھے ہٹ گیا۔کیوں؟ کیونکہ معاشرہ

اس کے اس عمل کا روادار نہیں۔آخیر میں ایک ایسا کردار بھی سامنے آتا ہے جو کی اہمیت شاید ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔یہ کردار اپنے لیے ایک ساتھی کا متلاشی ہے لیکن اسے اُس ساتھی سے مساوات کی کوئی خواہش نہیں بلکہ وہ سماج کے لیے ایسا ناسوری کردار بن کر اُبھرا ہے جسے اپنی نفسانی خواہش کے علاوہ کسی بات سے سروکار ہی نیں۔اس کے لیے عورت ایک شئے سے زیادہ کچھ نہیں۔جس کے نہ تو جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات۔وہ کسی سے شادی کرتا ہے لیکن اپنی شرطوں پر۔نسواں کو پامال کرتا ہے اس کی کیفیات کو جانے بغیر اس کے جسم وذہن پر قابض ہوجاتا ہے۔ اسے نہ تو اپنے ساتھی کی پرواہ ہے اور نہ ہی اس بات کا احساس کے ساتھی کی قربت کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

غرض عزیز احمد اپنے افسانے میں عورتوں کے حقوق اور اُن کی ادائیگی کے لیےسماج کو اُجاگر کرتے نظر آئے اُن کے فہم سے خواتین کا اسطرح استحصال گناہِ عظیم ہے عزیز احمد کا یہ افسانہ بے حد متاثر کن ہے اس میں انھوں نے جس بہترین انداز میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔اس حقیقت سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح اُس دور میں عورتوں کے حقوق کی پامالی کی جاتی رہی ہے آج کے دور میں بھی وہ کہیں نا کہیں یہ عمل دہرایا جارہا ہے۔آزادی کے اتنے سالوں بات ہم مساوات نسواں کا نعرہ بلند کرتے نہیں تھکتے لیکن حقیقت ہمارے سامنے کئی اشکال میں موجود ہیں۔آئے دن ہمارے اخبارات میں ایسی خبریں جا بجا موجود ہوتی ہیں جس میں عورتوں کے ساتھ ہوئی زیادتیوں کا شاخسانہ نظر آتا ہے۔یہ افسانہ ہماری سوچ کو متاثر کرتا ہیا وراس جانب راغب کرتا ہے کہ سماج اور ماحول کو کس

قدر سدھار کی ضرورت ہے۔عزیز احمد اپنا افسانہ کچھ ان الفاظ میں ختم کرتے ہیں۔

”اور وہ اجنبی مرد بھی اُس کے
ساتھ آیا تھا ۔وہ بھی اس گھر میں
موجود تھا۔رات کو پھر وہ اُس کے
جسم پر حکومت کرے گا۔اُس کے
ماں باپ اس کو اس طرح اُس
اجنبی مرد کے پاس بھیجے گے
جیسے کوئی نائکہ اپنی لڑکی کو
کسی دولت مند کی خواب گاہ میں
بھیجتی ہے“

(افسانہ رقص ناتمام۔مصنف:عزیز احمد۔صفحہ نمبر ۱۶۷)

☆☆☆

☆☆

☆

ایک نظر میں

قلمی نام	:	صدیقی صائم الدین
اصل نام	:	صدیقی محمد صائم الدین محمد سلیم الدین صدیقی
تاریخ پیدائش	:	3rd february 1988
مقام پیدائش	:	اورنگ آباد (دکن) مہاراشٹر
تعلیم	:	B.A,MA,M.PHIL(URDU)
حالیہ تعلیم	:	P.hD (URDU)
تصنیف	:	۱)مطالعہ معین احسن جذبی (شائع شدہ)
زیرِ طبع	:	۱)افسانوی مجموعہ
		۲)تنقیدی مضامین
پتہ	:	گھر نمبر 1/17/81 ،جونا بازار ہیڈ پوسٹ آفس، اورنگ آباد، مہاراشٹر۔
پن نمبر	:	431001
رابطہ نمبر	:	08623903034,08208101043
میل	:	siddiquisaim7@gmail.com
		siddiquisaim7@yahoo.com